فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1	اظہار تشکر	4
2	پیش لفظ	6
3	عرض امانت اور میثاق عام کی یاد دہانی سے مقدمے کی یاد دہانی ہوگی۔	8
4	انسان سے پہلے کائنات	12
5	خدا کا منصوبہ	15
6	ابن آدم کے ساتھ اللہ کا خصوصی معاملہ	18
7	تخلیق انسانی کا مقصد	20
8	خدا کے کلام کو سرسری بات سمجھنا	25
9	عبادت اور معرفت کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟	28
10	مرتبہ زاری	33
11	سبب فضیلت آدم اور ایک قصہ	36
12	قاموس القرآن میں لفظ امانت کی تشریح	42
13	معارف القرآن میں آیہ امانت کی تفسیر	43
14	عرض امانت کا واقعہ کس زمانے میں ہوا	44

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
15	خلافت کے لیے بارِ امانت اُٹھانے کی صلاحیت ضروری تھی	42
	مذکورہ موضوع سے متعلق عصر حاضر کے مشہور مفسرین کرام کی تشریحات	
16	مولانا مودودیؒ کی شرح ماخوذ از تفہیم القرآن	50
17	آیہ امانت کی تفسیر ماخوذ از تفہیم القرآن	61
18	تفسیر آیۂ الست بربکم از مولانا مودودیؒ	67
19	وما خلقت الجن والانس کی تفسیر ماخوذ از تفہیم القرآن	76
20	کنت کنزاً مخفیاً کی تشریح	84
21	وما خلقت الجن والانس الالیعلمون کی تفسیر از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	86
22	زمین وآسمان کی اوران کے کل نظم ونسق سے کیا مقصود ہے؟ ماخوذ از تفسیر عثمانیؒ	88
23	زمین ابلیس وآدم کا میدان جنگ ہے	91
24	تخلیق عالم کا تشریعی مقصد وتکوینی غرض کیا ہے؟	93
25	آیہ امانت کی بہترین اور دلنشین تشریح از مولانا عبدالحق حقانیؒ	95
26	قاموس القرآن میں اللہ کی محیر العقول قدرت کی تشریح از قاضی زین العابدین	99

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
27	قائم بالذات اور واجب الوجود صرف اللہ کی ذات ہے؟	105
28	تفسیر مظہری میں عرض امانت کی تفسیر کا خلاصہ	108
29	نبیوں سے کیا عہد لیا گیا؟ از تفسیر مظہری	110
30	اللہ تعالی کے تین عہد	112
31	زمین و آسمان چھ دن کے توقف کے ساتھ وجود میں لانے کی حکمت	113
32	سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ کے متعلق شبیر احمد عثمانیؒ کی تشریح	117
33	اللہ غیب میں ڈرنے والوں کی تلاش میں ہے	121
34	موضوع کی مناسبت سے چند سوالات اور ان کا جواب	125
35	خلاصۃ الکتاب	134

اظہار تشکر

میں مجلس علمی جموں وکشمیر جو کہ خالصتاً ایک علمی و دعوتی تحریک ہے کے تمام اراکین کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کتاب ''مقصد تخلیق انسان'' کو شائع کیا۔ یہ کتاب دراصل ''مقصد تخلیق کائنات'' کا ایک تسلسل ہے جس میں احقر نے کائنات اور انسان کے حوالے سے اللہ کے تخلیقی منصوبے پر قرآن وسنت کی روشنی میں مفصل روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ یہ تحقیقی مضمون شائع ہو جائے۔ میری اس خواہش کو مجلس نے پورا کیا۔ اللہ تعالی مجلس کی اس سعی جمیل کو شرف قبولیت سے نوازے۔ چونکہ مجلس کا شعبہ نشر واشاعت اپنا کام بڑی تندہی سے انجام دے رہا ہے اور قلیل مدت میں میری تین کتابیں ہزاروں کی تعداد میں شائع کیں۔ جو میرے لیے باعث سعادت ہے۔

کتاب کی اشاعت میں ایک اہم مرحلہ کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا ہوتا ہے۔ اس نازک اور محنت طلب مرحلے کو میرے فرزند ارجمند سالکؔ بلال نے اپنی متعدد مصروفیات کے باوجود نہایت جانفشانی سے انجام دیا۔ ان کی معاونت میرے دوسرے فرزند ''ماہنامہ راہ نجات'' کے اڈیٹر منیر احمد وانی اور حفید محمد اقبال وانی نے کی۔ میں اللہ تعالی کا بے حد شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے ایسے بچے عطا فرمائیے جو اس علمی مشن میں میرے شانہ بشانہ مصروف عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احقر خود کو کبھی اس

میدان میں تنہا محسوس نہیں کرتا۔
میری دلی تمنا ہے کہ مجلس اسی طرح علم وادب کے فروغ میں مصروف عمل رہے۔اور اہل علم کی رہنمائی میں یہ بابرکت سلسلہ ہمیشہ جاری وساری رہے۔

آسیؔ غلام نبی وانی

پیشِ لفظ

دنیا کی کسی بھی عدالت میں جب کوئی مقدمہ دائر کیا جاتا ہے تو ایک جج صاحب اس مقدمے کی چھان بین ابتداء سے شروع کرتا ہے ۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ جج صاحب مقدمے کے ساتھ جڑے ہوئے بنیادی واقعات سے صرفِ نظر کرے اور فریقین مقدمہ دائر کرتے وقت جس صورتِ حال پر فائز یا قابض ہوں وہاں سے ہی اپنی کاروائی شروع کرے بلکہ ایک عادل منصف دائر شدہ مقدمہ کی جانچ پڑتال ابتداء سے کرتا ہے اور پھر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ خرابی کہاں سے شروع ہوئی تا کہ اس سے پتہ چلے کہ اِس مقدمہ میں ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے ؟ اس چھان بین میں ایک جج صاحب کو کافی عرصہ لگتا ہے تب جا کر اُس پر یہ حقیقت کُھل جاتی ہے کہ اس زیر بحث مقدمے میں کس قسم کا فیصلہ صادر فرمانا مناسب اور قرینِ انصاف ہے ۔ اس چھان بین میں اگر کبھی کافی دیر بھی لگتی ہے تو جج صاحب کو معذور سمجھ اس تاخیر کو نظر انداز کیا جاتا ہے ۔ کسی بھی انسان کے خلاف جو مقدمہ خدا کے دربار میں روزِ محشر دائر ہونے

والا ہے وہاں روایتوں کے مطابق ایک طویل عرصہ اس مقدمے کی چھان بین میں طول پکڑے گا اور ہر انسان پر اُس کے نامہ اعمال کے عین مطابق ایک زبردست حجت پوری ہو جائے گی جس سے انکار کی کوئی گنجائش بندے کے پاس باقی نہیں رہے گی۔ اگر کوئی انسان غلط بیانی سے اپنے آپ کو سزا سے بچنے کی کوشش کرے گا تو اُس کے مُنہ پر مہر لگائی جائے گی۔ ہونٹ بند کئے جائیں گے جیسا کہ قرآن میں لکھا ہے

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (65) سورہ یاسین

(ترجمہ) آج کے دن ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کمائی کیا کرتے تھے۔ (آسان ترجمہ قرآن از مفتی تقی عثمانی)

عرض امانت اور میثاقِ عام کی یاددہانی سے مقدمے کی ابتداء ہوگی

مفسرین قرآن اور شارحینِ حدیث انسانی تخلیق کی غرض و غایت جن مختلف پیرائیوں میں بیان کرتے ہیں اس کا خلاصہ درجِ ذیل سطور میں یوں بنتا ہے ''ابتداء میں اللہ کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور اس کی ذات بغیر کسی ابتداء کے ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہنے والی ہے ۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ اس کی ذات میں جو بیشمار صفات موجود ہیں ان کا وہ اظہار کرے ۔لیکن اِن کے اظہار کے لیے ایک ایسی مخلوق کی ضرورت تھی جن پر اِن صفات کا اظہار کیا جائے مثلاً اللہ نافع ہے یعنی نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے ۔ یا نقصان پہنچانے کی صفت کا مالک ہے ۔لیکن اس کا اظہار کس پر ہو اس کے لیے ایک مخلوق کی ضرورت تھی ۔ چونکہ بذات خود وہ خالق ہونے کی صفت وقدرت بھی رکھتا تھا لہٰذا اُس نے ارادہ کیا کہ ایک ایسی مخلوق کو وجود بخشے جن پر اپنی صفات کا اظہار کرے ۔اور یہ مخلوق اللہ کی مشیت میں بشکل انسان ٹھہری ۔اللہ چونکہ اپنی بے شمار صفات میں سے دو صفات کا خصوصیت کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا تھا ایک

صفت رحمت اور دوسری صفت غضب۔اس کے لیے اللہ نے انسان کا وجود میں لایا جانا طے کیا۔اسی بات کو مولانا رومیؒ نے اپنی مشہور و معروف کتاب مثنوی میں یوں بیان فرمایا ہے ؎

بہر اظہار ہست ایں خلقِ جہاں
تا نہ ماند گنج حکمت ہا نہاں

(ترجمہ)مولانا اللہ کی طرف سے ایک حکایت کے انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ اے لوگو ان ہی صفات کے اظہار کے لیے دُنیا کی تخلیق کی گئی تا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے خزانے پوشیدہ نہ رہیں رحمٰن ورحیم ہونے کی وجہ سے رحمت ومغفرت سے کن کو نوازے اور جبار و قہار ہونے کی وجہ سے اس کے قہر وغضب کا نشانہ کون بنے اس کے لیے اُس نے ایک معتدل منصوبہ تشکیل دیا جو ہمیشہ سے اللہ کے علم میں تھا اور اس منصوبے کو روبہ عمل لانے کے لیے حضرت آدم کو پیدا کرنا چاہا اور آدمؑ کی پشت میں قیامت تک آنے والی ذریت کا مادہ رکھا۔حضرت حوا کو ایک عجیب انداز سے اُس کی پسلی سے پیدا کیا جو حضرت آدم کے لیے مونس ومعاون بنی ۔ اور پھر حضرت آدم کو حضرت حوا پر تصرف عطا فرمایا اور عقدِ نکاح میں باندھا۔اُن کے باہمی ملاپ سے قیامت تک نسل انسانی کو وجود میں لانے کا سلسلہ قائم فرمایا۔بنیادی ضرورتوں کے اسباب تمام نسل انسانی کو یکساں

طور سے عطا فرمائے۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی، جسمانی اعضاء وغیرہ البتہ دُنیا کے اندر نظم وضبط قائم رکھنے کے اعتبار سے چند ایک اسباب میں بندوں کے درمیان ضرور تفاوت رکھی جس میں بندوں ہی کے لیے مصلحتیں چھپی ہوئی تھیں ۔ اور ذریّتِ آدم کا یہی انبوہ (Crowd) خدا کی صفتِ رحمت وغضب کا نشانہ ٹھہرا۔ اور قیام عدل کے لیے نوازنے یا لتاڑنے سے پہلے ہر انسان کا انفرادی امتحان لینا چاہا۔ صاف وشفاف امتحان لینے کے لیے دُنیا کے ہر انسان کو ارادے کی آزادی عطا فرمائی چنانچہ اس آزادی کا ثبوت قرآن حکیم کی اس آیت سے واضح طور سے ہو جاتا ہے۔ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً (2) إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً (3) (سورہ دہر آیت نمبر ۲ تا ۳)

(ترجمہ) ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے پیدا کیا، پھر اسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، وہ دیکھتا بھی ہے۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا کہ وہ یا تو شکر گذار ہو، یا ناشکرا بن جائے۔ (آسان ترجمہ قران از مفتی تقی عثمانی)

غرض تخلیق آدم سے مُراد ایک ایسی پُراسرار مخلوق کو وجود بخشنا ٹھہرا جو اللہ کے حضور میں اُس کی بڑائی کا اقرار کرنے کے بعد اگر کسی ایسی دنیا میں بھیجی جائے جہاں بظاہر خدا غائب رہے تو وہ اس دنیا میں اسی طرح خدا کی کامل بندگی کا ثبوت دیں اور اس طرح اللہ کے سب سے بڑا انعام پانے کا

مستحق ٹھہرے اور اسی طرح اُن انسانوں کو خدا کی سب سے بڑی سزا سے ہمکنار کیا جائے جو اُس کے سامنے اُس کی بڑائی کا اظہار تو تسلیم کریں لیکن عالم دنیا کے اندر پہنچ کر اپنے وعدے سے مکر جائیں اور اللہ نے تمام مخلوقات میں جو ارادے کی آزادی اُن کو عطا کی تھی اُس کا غلط استعمال کریں۔ معلوم ہوا کہ یہ دنیا ایمان بالغیب پرکھنے کی کسوٹی ہے چنانچہ مولانا رومیؒ اللہ کی طرف سے حکایتاً بیان فرماتے ہیں کہ ؎

یومنون بالغیب مے باید مرا
تا بہ بستم روزنِ فانی سرا

(ترجمہ) اس دنیا کے اندر تمہارے لانے کا واحد مقصد تمہارے ایمانِ بالغیب کا امتحان ہے اسی لیے زمین آسمان کی سب کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔

انسان سے پہلے کائنات

اس امتحان کا جائے وقوع (Venue) اِس دُنیا کو بنایا۔ دنیا کو بنانے کے ساتھ ساتھ آسمان وغیرہ کو بھی سجایا تا کہ اِمتحانی ہال کے سارے طلباء کو یکساں سہولتوں سے فیضیاب رکھا جائے۔ اور انسانوں کے ایک خاص ترتیب سے دُنیا میں لانے سے پہلے سبھی انسانوں کو اپنی قدرت سے ایک مثالی انداز میں چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی صورت میں پُشتِ آدم سے نکال کر ایک وسیع میدان میں اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا **الست بربکم** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سبھوں نے جواب دیا **قالو بلیٰ** ۔ یا اللہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ اپنی ربوبیت کا اقرار لینے کے بعد اللہ نے اس تمام نسل انسانی کو پھر آدم کی پشت میں داخل کیا اور فرمایا کہ اب دُنیا کی اس امتحان گاہ میں تم کو باری باری لاؤں گا اور وہاں پہنچ کر تمہیں دوبارہ یاد دلانے کے لیے انبیاء کو بھیجوں گا اس طرح تمہاری مزید راہبری و راہنمائی کا انتظام کروں گا لیکن ساتھ ہی آزادی بھی عطا کروں گا۔ بظاہر تم سے چھپ جاؤں گا اور یہ عہد جو تم نے میرے ساتھ کیا اس پر قائم رہنے کا عملی ثبوت تمہیں اُس

امتحان گاہ میں دینا ہوگا جہاں یہ عہد و پیمان یاد دلانے کے لیے اپنے خاص بندوں کو منتخب فرما کر تمہاری اصلاح کے لیے لگا تار بھیجتا رہوں گا جن کی بات پر لبیک کہنا تمہارے لیے ضروری ہوگا۔ وہ تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگیں گے لیکن ان کا ساتھ دینا تمہارے لیے لازمی ہوگا۔تمہارے اوپر کوئی زور زبردستی نہیں ہوگی ۔تم چاہو تو فرمانبردار بن کر رہو اور ایسا نہ چاہنے کی صورت میں نافرمانی کا وطیرہ بھی اختیار کر سکتے ہو۔ لیکن فرمانبردار بن کر رہنے کی صورت میں تمہیں ایسے انعام سے نوازوں گا جو میری قدرت کی طرف سے تم بندوں پر سب سے بڑا انعام ہوگا اور ایسا بڑا انعام کہ فی الحال اُس کا تصور تک بھی آپ نہیں کر سکتے ہو۔اور انبیاء کرام کی یاد ہانی کے باوجود اگر نافرمان بنو گے تو ایسی سزا بھگتنی پڑے گی جواب تک کسی کو نہیں دی گئی ہے۔ انسان نے رب العالمین کے اس فیصلہ پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور انعام کی لالچ میں آ کر امتحان کی اس چوٹی کو سَر کرنا چاہا۔ زمین، آسمان، پہاڑ، فرشتے وغیرہ سب دیگر مخلوقات ایسی نازک ذمہ داری سر پر لینے سے لرز اٹھے اگر چہ وہ جانتے تھے کہ بصورتِ کامیابی وہ کس عظیم انعام کے مستحق بن سکتے ہیں لیکن ناکامی پر جس عذابِ الیم کا خطرہ بیان کیا گیا اُسکو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی خیریت اور عافیت کنارہ پر رہنے میں ہی سمجھ لی ۔ گویا یہ ساری

مخلوق بہ زبانِ حال جو نقشہ پیش کر رہی تھی اُس کا احاطہ غالباً اس شعر کے ذریعے بہت حد تک ہوسکتا ہے ؎

بہ دریا در منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت بر کنار است

ترجمہ: دریا میں غوطہ لگانے کے بے شمار فوائد ہیں۔ مثلاً (لعل و جواہر کا حاصل ہونا) لیکن اگر سلامتی درکار ہے تو وہ کنارے پر رہنے میں ہی ہے۔ نارِ جہنم میں جھلسنے کے پیشِ نظر امتحان میں اترنا ہی نہ چاہا لیکن ضعیف انسان نے انعام (جنت) کی لالچ میں اس امتحان میں اترنا چاہا۔ ؎

آسمان بارِ امانت نتوانست کرد
قرعہ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند (حافظ شیرازی)

ترجمہ:۔ آسمان اِس بارِ امانت کو اٹھانے سے لرز اُٹھا لیکن قرعہ اندازی کر کے فال مجھ دیوانہ کے نام نکلا۔

اب ہم سب کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ ہم کون سا عہد اپنے رب کے ساتھ باندھ کر آئے ہیں۔ اور اُس کے پورا کرنے میں ہمارے لیے عیش و عشرت کا کس قدر سامان رب کی طرف سے ملنے والا اور اس کے پورا نہ کرنے کے سلسلے میں ہم کیسے زبردست خسارے میں پڑنے والے ہیں اے اللہ ہمیں خسارے میں پڑنے سے بچا دے اور انعام سے نواز دے آمین۔

خدا کا منصوبہ

منصوبہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ **Plan** بنتا ہے۔ ایک انسان بھی اپنی کسی ضرورت کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے اور اس منصوبہ کو عملی شکل دینے کے لیے تدبیریں سوچتا ہے۔ کبھی کسی امر میں جوڑ توڑ سے کام لیتا ہے۔ حکمت و دانائی کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی منصوبہ بندی کبھی کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی نا کام۔ اس کے برعکس جب ہم اللہ کی منصوبہ بندی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ منصوبہ بندی اللہ کے علم میں ہمیشہ سے محفوظ ہوتی ہے اور اس میں کسی سہو و خطا کا ذرا بھی امکان نہیں ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار کرنے کے لیے وہ زمان و مکان کا محتاج نہیں۔ بلکہ وہ زمان و مکان کا خالق بھی ہے اور مالک بھی۔ گویا اللہ کی منصوبہ بندی ایک آقا کی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور بندوں کی منصوبہ بندی ایک غلام کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ ایک بشر ہونے کے ناطے انسان کی منصوبہ بندی میں ہر وقت سہو و خطا کا امکان ہوتا ہے۔ اللہ کا کوئی بھی منصوبہ اس کے علم میں ہمیشہ سے موجود تھا لیکن اپنی قدرت کاملہ کے اعتبار سے اس منصوبے کا اظہار اس کے مناسب وقت پر کرتا ہے۔ وہ صاحبِ ارادہ ہے اور اپنے ارادے کا اظہار کسی بھی وقت کر سکتا ہے۔ ایک انسان کی تخلیق کا ارادہ اگر چہ اس کے علم میں

ہمیشہ سے تھا لیکن اس کا عملی اظہار اس نے کائنات کی تخلیق کے بعد اُس وقت کیا جب کہ پہلے اُس نے سیارہ زمین کو انسان کی بود و باش کے قابل بنا کر وجود بخشا تھا۔ یہ بات اللہ کے علم وارادہ میں ہمیشہ سے موجود تھی کہ وہ اپنی صفات کا اظہار کرے خاص کر صفت غفاری وقہاری کا۔ لیکن اللہ کی صفت غفاری کا اظہار کس پر ہو اور صفت قہاری کا اظہار کس پر ہو اس کے اظہار کے لیے اللہ نے اس سیارہ زمین کو لیبارٹری کے طور پر وجود بخشا۔ لیبارٹری سائنسی زبان میں اُس جگہ کو کہتے جہاں سائنسی تجربات کئے جاتے ہیں۔ سائنسدان تجربات اس لیے کرتے ہیں تا کہ کسی بات کی حقیقت اُن پر کھل جائے۔ جس کا انکشاف اُس سے پہلے اِن پر نہیں ہوا تھا۔ لیکن دنیا کی لیبارٹری اللہ نے اس لیے تشکیل دی ہے تا کہ حقیقت کا انکشاف بندوں پر ہو جائے۔ کہ وہ کس جزاً وسزا کے مستحق ہیں ورنہ اللہ کو کسی حقیقت کو جاننے کے لیے کسی تجربہ گاہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ کسی بھی چیز کو وجود بخشنے سے پہلے اُس چیز کے منطقی انجام کو وہ جانتا ہے۔ اور اس میں اُس کو کسی کے تعاون کی کوئی ضرورت نہیں ہے اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر اگر وہ جانچ پرکھ کے بغیر ہی کسی کو جہنم میں ڈال دیتا تو اُس کا اُس کو کامل اختیار تھا لیکن جس طرح غفار وقہار ہے اسی طرح وہ علیم وخبیر بھی ہے اور عدل پرور بھی۔ اُس کے صاحب عدل ہونے کا تقاضا دامنگیر ہوا کہ وہ جنت وجہنم میں بندوں کو اُن پر حجت پوری ہونے کے بعد داخل کرے۔ تا کہ ادخال سے پہلے اُن کو

اپنے اعمال دکھا کر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کس انجام کے مستحق تھے اور اس معاملے میں اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔اس طرح مسلم و مجرم کو علاحدہ کر کے اپنی شانِ رحمانی وقہاری کا اظہار کرے۔اور اُس کا عدل وانصاف بندوں پر واضح ہو جائے۔رہا یہ سوال کہ اپنی شانِ رحمانی وقہاری کا اظہار کرنا ہی کیا ضروری تھا ایک ایسا سوال ہے جو اپنے آپ کو دریائے خون میں ڈبونے کے مانند ہے۔یہاں بجز تسلیم و رضا کے کوئی چارہ کار نہیں۔اور کامل مالک کو ہر طرح کا اختیار رہوتا ہے۔

یہ منصوبہ اللہ کے علم میں ہمیشہ سے تھا لیکن اس کی عملی تشکیل تخلیق کائنات وآدم سے ہوئی۔اللہ نے پہلے سے ہی ہر انسان کے لیے ایک جنت و جہنم کو سجایا ہے اور داخلہ سے پہلے جنت والوں کو جہنم اور جہنم والوں کو جنت دکھائی جائے گی اور جہنم والوں سے کہا جائے گا کہ اگر تم نے فرمانبرداری کا طریقہ اختیار کیا ہوتا تو تمہارے لیے وہ جنت تھی۔اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ اگر تم نے نافرمانی کا وطیرہ اختیار کیا ہوتا تو تمہارے لیے وہ جہنم تھی۔

ابن آدم کے ساتھ اللہ کا خصوصی معاملہ

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے ''جب خداوند تعالےٰ نے آدمؑ اور ان کی اولاد کو پیدا کیا تو فرشتوں نے کہا اے پروردگار تو نے اس مخلوق کو پیدا کیا جو کھاتی ہے پیتی ہے۔ نکاح کرتی ہے اور سوار ہوتی ہے اس کو دنیا دیدے اور ہم کو آخرت مرحمت فرما۔ خداوند تعالےٰ نے فرمایا جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور جس میں میں نے اپنی روح پھونکی ہے۔ وہ اس جیسی مخلوق نہیں ہوسکتی جس کو میں نے کُن کہہ کر پیدا کیا اور وہ پیدا ہوگئی۔ یعنی آدم اور اُن کی اولاد کو میں نے خاص اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور باقی مخلوق فرشتے وغیرہ کُن سے پیدا کئے ہیں۔ دونوں میں مساوات نہیں ہوسکتی
(رواہُ البیہقی فی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ حدیث نمبر ۵۴۸۵)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ انسانوں کے ساتھ اللہ کا کتنا بڑا خصوصی معاملہ ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ فضل باری

میرے مولا یہ تیری مہربانی

اسی بات پر مولانا رومیؒ افسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی مثنوی میں

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

خویشتن نشناخت مسکین آدمی
از فزونی آمد و شُد در کمی
خویشتن راآدمی ارزاں فروخت
بود اطلس خویش رابر دلق دوخت

ترجمہ:۔آدمی مسکین نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ بڑائی سے آیا اور کمی میں مبتلا ہو گیا۔آدمی نے اپنے آپ کو سستا بیچا۔اطلس تھا اپنے آپ کو گدڑی پر سی دیا۔

تخلیق انسانی کا مقصد

تخلیقِ انسانی کے اغراض ومقاصد پر غور کرنے کے لیے ہمارے پاس بظاہر دو راستے ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان از خود اپنے فہم وتدبر سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کرے اور جستجو سے کام لے کر رازِ حیات وممات کو پانے میں کامیابی حاصل کر سکے اور اُس کو اپنے پیدائش کے مقصد اور اصل راز تک رسائی حاصل ہو سکے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ اس تلاش میں لگ جائے کہ جس خالق نے اس کائنات کو بشمول انسان پیدا کیا اُس کا منشاٗ کیا ہے اور وہ تخلیق کائنات وآدم سے کیا چاہتا ہے۔ پہلے نظریئے کو اپنانے والے بھی کچھ نہ کچھ لوگ اِس دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں جن کو عام طور پر فلسفی کہتے ہیں اور اُن کی سوچ کو فلسفیانہ سوچ کہتے ہیں لیکن فلسفیانہ سوچ میں ہمیشہ تضاد رہا ہے اور انجام کے اعتبار سے اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں کسی ایک نکتے پر متفق ہونا انسانوں کے لیے ناممکن بن جاتا ہے۔ کیوں کہ کہا گیا ہے **There is always diversity in human thoughts** یعنی انسانی افکار میں ہمیشہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ دوسرا طرزِ فکر یہ ہوسکتا ہے کہ کیوں نہ ہم اس تحقیق میں لگ جائیں کہ جس خالق ومالک

نے اس کائنات کو لا مثال شفافیت کے ساتھ بے نقص بنایا ہے اس کا منشاٗ جاننے کیلئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیوں کہ اس سے بڑھ کر کسی کی راہبری و راہنمائی نہ صحیح ہوسکتی ہے اور نہ مفید۔اس کے نزدیک اس کائنات کی اسکیم کیا ہے اور اس اسکیم کے پیچھے اُس کا منشاٗ کیا ہے۔ یہ باتیں وہی بیان فرما سکتا ہے اور وہی بات انسانوں کے لیے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ حافظ شیرازیؒ نے شاید اسی لئے اپنی دیوان میں یہ شعر رقم طراز کیا ہے ؎

جنگ ہفتاد و دوملت را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

(ترجمہ) بہتّر (72) ملتوں کے اختلاف کو معذور سمجھ چونکہ انہوں نے حقیقت نہ دیکھی تو افسانہ کی راہ چل پڑے۔ایسا اختلاف کرنے والوں کے متعلق مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں ایک قصّہ لکھا ہے وہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔خلاصہ اُس قصے کا یہ ہے کہ انسانی افکار میں ہمیشہ تنوع (اختلاف) پایا جاتا ہے۔

ان فلسفیوں کے بالمقابل ایک معروف طبقہ ہر دور میں موجود رہا ہے جن سے پوری انسایت باخبر ہے اور وہ پیغمبروں کا طبقہ ہے وہ نہ صرف پیغمبر ہونے کا دعوی کرتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔بظاہر اپنی ذات کے اعتبار سے وہ ابن آدم ہی ہوتے ہیں لیکن اپنی صفات کے اعتبار سے وہ دوسرے ہم عصر انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

انسانیت نے اُن اوصاف کو نہ صرف ہمیشہ سراہا ہے بلکہ اُن کی صحبت و تربیت میں جو لوگ آتے رہے وہ اپنی سیرت کے اعتبار سے ایک مثالی انسان کی حیثیت سے اُبھرتے رہے۔ اُن کی زندگیوں میں وہ نظم وضبط ظہور پزیر ہوا جس کو دیکھ کر ہر شخص عش عش کرنے لگا ہے۔ یہ پیغمبر جو کچھ بولتے ہیں اُس کے متعلق اُن کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات سے کچھ بھی نہیں کہتے بلکہ وہی کہتے ہیں جس کا حکم اُن کو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ فرمانِ رب کی طرف ہوتا ہے۔ **وما ینطق عن الھوی . ان ھو االا وحی یوحیٰ** ۔سورہ نجم آیت نمبر۴۔۵) ترجمہ: اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں۔ ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے‘‘۔

وہ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ اُن کی تعلیم اُن کا کوئی نظریہ نہیں ہے بلکہ وہ حق گوئی کے ساتھ اِن ہی باتوں کی دعوت دیتے ہیں جو کائنات کا خالق و مالک اُن سے کہلوانا چاہتا ہے۔ اگر چہ اللہ ہر انسان تک بذاتِ خود یہ پیغام پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے پھر بھی کئی خاص مصلحتوں کی بنیاد پر ایک خاص بندے کو ہی چُن کر یہ باتیں کہلواتا ہے۔ اِن پیغمبروں کی سیرت اتنی صاف اور بے داغ ہوتی ہے کہ کوئی شخص پوری زندگی میں ان سے کوئی جھوٹ ثابت نہیں کرسکتا ہے۔ ان کی تعلیم اتنی شفاف اور دلنشین ہوتی ہے جو لوگوں کے دلوں کے اندر تیر کی طرح گھس جاتی ہے۔ اور انسان کی بے آمیز فطرت اس بات کی گواہی دینے کے لیے مجبور ہوجاتی ہے کہ واقعی یہ شخص سچا

ہے۔اس کی زندگی بے داغ ہے اور تعلیم سچی۔انسان کی فطرت گواہی دیتی ہے کہ ایسا ہی شخص انسانوں کا صحیح قائد ہوسکتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ یَزَالُونَ مُخْتَلِفِیْنَ (118)إِلاَّ مَن رَّحِمَ رَبُّکَ وَلِذَلِکَ خَلَقَهُم وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ لأَمْلأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ (119)

(سورہ ہود)

(ترجمہ) اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقے کا پیرو بنادیتا، (مگر کسی کو زبردستی کسی دین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے۔اس لئے انہیں اپنے اختیار سے مختلف طریقے اپنانے کا موقع دیا گیا)۔اور وہ اب ہمیشہ مختلف راستوں پر ہی رہیں گے۔البتہ جن پر تمہارا پرورگار رحم فرمائے گا، ان کی بات اور ہے (کہ اللہ انہیں حق پر قائم رکھے گا) اور اسی (امتحان) کے لئے اس نے ان کو پیدا کیا ہے اور تمہارے رب کی وہ بات پوری ہوگی جو اس نے کہی تھی کہ: ''میں جہنم کو جنات اور انسان دونوں سے بھر دوں گا''۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں یہ بات لکھی ہے کہ ''یہ بات قرآن کریم نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو زبردستی ایک ہی دین کا پابند بنادیتا۔لیکن اس کائنات کی تخلیق اور انسان کو اس میں بھیجنے کا بنیادی

مقصد یہ ہے کہ انسان کو اچھے بُرے کی تمیز سِکھا کر اُسے یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اختیار اور مرضی سے جو راستہ چاہے، اختیار کرے۔اسی میں اس کا امتحان ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اختیار کو ٹھیک استعمال کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں جنت کماتا ہے، یا اس کا غلط استعمال کر کے دوزخ کا مستحق بن جاتا ہے۔اس امتحان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی کو اُس کے اختیار کے بغیر زبردستی کسی ایک راستے پر نہیں رکھا''۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے'' خود اس کی حکمت یہ ہے کہ جس طرح مرحومین میں نعمتِ رحمت کا ظہور ہوا، مغضوبین میں صفت غضب کی ظہور ہو، پھر اس ظہور کی حکمت یا اس حکمت کی حکمت اللہ ہی کو معلوم ۔غرض اس ظہور کی حکمت سے جہنم میں جانا بعضوں کا ضروری اور جہنم میں جانے کے لیے وجود کفار کا تکویناً ضروری، اور وجود کفار کے لئے اختلافات لازم۔یہ وجہ ہے سب کے مسلمان نہ ہونے کی۔

خدا کے کلام کو سرسری بات سمجھنا

انسان کا سب سے بڑا جرم جو اس دنیا کے اندر ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا کے کلام کو ایک سرسری بات سمجھتا ہے ۔حالانکہ قرآن للکارتا ہے کہ یہ قرآن کوئی معمولی کلام نہیں ۔اگر دنیا کے تمام عقلمند لوگ قرآن جیسی ایک آیت ہی بنانا چاہیں نہیں بنا سکتے ہیں ۔اس معیار کا کلام ہونا ہی اس بات کی سچائی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ قرآن میں اس کائنات کا اور اس کی تمام دیگر چیزوں کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے وہ صاف لفظوں میں بتاتا ہے کہ اے لوگو یہ کائنات تمہارے لئے ایک ***life support system*** یعنی معاون حیات نظام ہے۔ چنانچہ سورہ عبس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے **فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَى طَعَامِهِ (24)أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاء صَبّاً (25)ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقّاً (26)فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبّاً (27)وَعِنَباً وَقَضْباً (28)وَزَيْتُوناً وَنَخْلاً (29)وَحَدَائِقَ غُلْباً (30)وَفَاكِهَةً وَأَبّاً (31)مَّتَاعاً لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ 3)**۔ترجمہ: پھر ذرا انسان اپنے کھانے ہی کو دیکھ لے! کہ ہم نے اوپر سے خوب پانی برسایا۔ پھر ہم نے زمین کو عجب طرح پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں گلے اُگائے اور

انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے گھنے باغات اور میوے اور چارہ۔ سب کچھ تمہارے مویشیوں کے فائدے کی خاطر''.

آخری آیت پر ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح طور سے سمجھ میں آتی ہے کہ یہ تمام چیزیں اللہ تبارک تعالیٰ نے صرف ہمارے لئے پیدا فرمائی ہیں اور ہمارے مویشیوں کے لئے گویا کہ یہ سب چیزیں تمہارے لئے ہیں قاضی زین العابدین صاحب نے قاموس القرآن میں لکھا ہے کہ لفظ مَتَاع کی جمع '' اَمْتِعَة '' ہے یعنی بہرہ مند کرنا یعنی یہ سب چیزیں تمہارے لئے پونجی ہیں یا یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں تم بطور اسباب خانہ استعمال کرتے ہو۔ عصری اُسلوب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں ہمارے لئے معاونِ حیات نظام کا درجہ رکھتی ہیں ۔یعنی **Life support system** ''اور قرآن اور رسول کو اس غرض کے لئے بھیجا تا کہ ہم اپنے آپ کو جنت میں داخل کرانے کے لئے اہل ثابت کرسکیں۔ چنانچہ سورہ طلاق کی آیت نمبر ۱۰۔۱۱ میں اللہ صاف لفظوں میں فرماتا ہے **فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْراً (10) رَّسُولاً يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحاً يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ**

فِيهَا أَبَداً قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقاً (11) ترجمہ:۔لہٰذا اے عقل والو جو ایمان لے آئے ہو، اللہ سے ڈرتے رہو۔اس نے تمہارے پاس ایک سراپا نصیحت بھیجی ہے۔یعنی وہ رسول جو تمہارے سامنے روشنی دینے والی اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں، تا کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں۔ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرے، اللہ اُس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں جنتی لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔اللہ نے ایسے شخص کے لئے بہترین رزق طے کر دیا ہے"۔ اس آیت شریفہ میں اللہ تعالی واضح طریقے سے بتا تا ہے۔کہ یہ جو رسول اور قرآن ہم نے بھیجا ہے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو تا کہ تم کو اللہ ہمیشہ رہنے والی جنت میں داخل کرے۔اس پاک کلام میں ایک ایک مضمون کو کئی بار مختلف پیرایوں میں سمجھایا ہے اور ہماری اخلاقی اور ایمانی تربیت کے لئے ان دونوں نعمتوں کو ایک معاون اخلاق نظام ***Moral Support system*** کے طور پر مہیا فرما کر ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔

عبادت اور معرفت کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (56) سورہ الذاریات ۔(ترجمہ)اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔حضرت ابن عباسؓ **الا لیعبدون** کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ **الا لیعرفون**۔غور طلب امر یہ ہے کہ جب عبادت اور معرفت دو الگ الگ الفاظ ہیں تو اِن کے معنیٰ میں مماثلت کی کیا وجہ ہے؟غور کرنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی عبادت کی اصل معرفت ہی ہے۔معرفت پہنچاننے کو کہتے ہیں۔جب بندہ باریک بینی کے ساتھ اپنی ذات سے لیکر کائنات کے مختلف اجزأاور ان کے درمیان باہمی نظم وضبط کے مظاہرے پر غور وفکر کرتا ہے تو اس کا دل ودماغ گواہی دیتا ہے کہ یہ نظم وضبط ایک خاموش زبان میں اعلان کرتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک زبردست کارساز کا دست قدرت کارفرما ہے۔اور پھر جب اِنسان اُس کی عظمت وقوت پر گہرائی کے ساتھ سوچتا ہے تو اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔اُسکا سر اُس کے آگے جھکنا شروع ہوجاتا ہے۔اور اپنی غلامی، کمزوری اور بے بسی کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاکر ایک ایسی زبان تلاش کرتا ہے جس سے وہ اپنے خالق، مالک اور پالنہار کی تعریف و

توصیف بیان کر سکے۔ اُس کی زبان پر بے اختیار اس قسم کی تسبیح جاری ہوجاتی ہے۔

سبحانک ما عبدناک حق عبادتک

سبحانک ما عرفناک حق معرفتک

سبحانک ما ذکرناک حق ذکرک

سبحانک ما شکرناک حق شکرک

معلوم ہوگیا کہ عبادت ومعرفت کا آپس میں ایک ایسا رشتہ ہے جو نا قابل تنسیخ و نا قابل تقسیم ہے۔ ایسے شخص کی معرفت، عبادت ہے اور عبادت معرفت۔

[ایک مثال]

ایک آدمی کے گھر میں اچانک ایک بڑا پولیس آفیسر داخل ہوا۔جبکہ اس کی گود میں ایک نوعمر بچہ تھا یہ شخص فوراً کھڑا ہوگیا اور بصد احترام اس کو قالین پر بٹھایا اور اس کی خاطر تواضع کرنے میں مشغول ہوگیا۔گود میں رکھا ہوا بچہ فوراً اس آفیسر کے ساتھ لپٹا اور اس کی وردی کے سٹار اپنی معصومیت کی وجہ سے اُکھاڑنے لگا۔اور ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔گھر کے مالک نے پولیس آفیسر کے ہاتھ پیر دبانے شروع کئے لیکن اس کا بچہ اپنی معصومیت کی وجہ سے اُسکی مونچھوں کے بال بھی نوچنے لگا۔ باپ کے طرز عمل اور معصوم بچے کے طرزِ عمل میں اتنا فرق کیوں؟ بات واضح ہے

کہ باپ عارف ہے اوراس کواس آفیسر اوراس کے اختیارات کی پہچان ہے اور معصوم بچہ غیر عارف ہے۔ اسی طرح ایک سمجھ دار آدمی جب زمین اور آسمان اوراس کی عجائبات پر غور کرتا ہے تو اُس کے اوپر اُس ہستی کا خوف اور ڈر چھا جاتا ہے۔ اس کی لامثال کاریگری کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتا ہے اور پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ ساری چیزیں مل کر اسی کی خدمت میں لگائی گئیں ہیں تو اس کو اس مہربان آقا کی شفقت پر پیار آتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ اگر میں اس مہربان آقا پر سو جی جان سے بھی قربان ہو جاؤں گا پھر بھی کم ہے۔ ایک طرف سے اُسکی عظمت کا خوف اور دوسری طرف سے اُس کی شفقت کا احساس اس پر غالب آجاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں مولانا رومیؒ کے اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے

اے خدا احسان تو اندر شمار

مے نتانم باز بانِ صد ہزار (رومیؒ)

(ترجمہ) اے خدا میں آپ کے احسانات کو کبھی شمار نہیں کرسکتا ہوں۔ چاہے میرے پاس لاکھوں زبانیں ہوں ایسا بندہ چاہے دن رات ذکر وشکر میں مشغول رہے، پھر بھی خدا کے احسانات وانعامات کی بارش کے آگے اپنے آپ کو شرمندہ پاتا ہے۔ جب عرب کے بدوی لوگوں کے سامنے دین کی دعوت پیش کی گئی تو انہیں سب سے پہلے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ اُن کو خدا کا تعارف اس طرح کرایا گیا۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (17)وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (18)وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ (19)وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (20)

(ترجمہ) تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا اور آسمان کو کس طرح بلند کیا گیا، اور پہاڑوں کو کہ انہیں کس طرح گاڑا گیا اور زمین کو کہ اُسے کیسے بچھایا گیا۔ (آسان ترجمہ قرآن از مفتی تقی عثمانی)

گویا کہ اُنہیں ان چیزوں پر غور وفکر کرنے کی دعوت اس لیے دی گئی تا کہ انہیں اپنے حقیقی خالق و مالک کا تعارف حاصل ہو جائے۔ اسی تعارف کو معرفت کہتے ہیں۔ پھر جب خدا کا تعارف حاصل ہونے کے بعد اللہ کی عبادت کی جاتی ہے وہ عارفانہ عبادت کہلاتی ہے۔ اگر اس کو ''لِيَعْبُدُون'' کے لفظ کی شکل میں پیش نہ کیا جاتا تو بہت سارے لوگ صرف پہچان یا معرفت کو ہی دین سمجھتے اور عبادت (جس کے ذریعے انسان عملی طور سے عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے) اُسکو ہلکا سمجھتا اور صرف معرفت پر ہی اکتفا کرتا۔ یہ قرآن حکیم کا ایک زندہ معجزہ ہے کہ اُس نے مقصد زندگی کو ایک ایسے لفظ کی شکل میں ملبوس فرمایا جس میں معرفت خود بخود شریک سفر بن کر انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ جب معرفت اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے تو وہ پُکار اُٹھتا ہے کہ:

اللھم لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ

نفسک و اعز جارک وجلَّ ثناء ک وتقدست اسماؤک واعظم شانک ولااله غیرک

(ترجمہ) میں تیری تعریف کا شمار نہیں کرسکتا ہوں ۔تُو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی ذات کی صفات بیان کی ہیں ۔ غالب ہے وہ جو تیری پناہ میں آئے اور تیری تعریف سب سے برتر ہے اور بہت پاکیزہ ہیں تیرے نام اور تیری شان بلند ہے اور تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔

اس طرح بندہ زروزور کے نشے سے چھٹکارا پاکر اپنے کو عاجزی وانکساری،نرم گفتاری وخاکساری کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔

مرتبہ زاری

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ خدا کے دربار میں نہ زر چلتا ہے نہ زور چلتا ہے بلکہ زاری چلتی ہے۔ انسان کی عظمت و بزرگی اس کی عاجزی و انکساری میں چھپی ہوئی ہے۔اس کا مظاہرہ ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم سے اُس وقت کرایا گیا جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے فرمایا تھا کہ **ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین**۔(ترجمہ) مگر اس درخت کے پاس بھی مت جانا ورنہ تم ظالموں میں شمار ہو گے (آسان ترجمہ قرآن) لیکن بسبب بشریت حضرت آدم سے لغزش صادر ہوئی اور اس پر اللہ نے جب باز پرس فرمائی تو حضرت آدم کو فوراً اپنی خاکی فطرت کی وجہ سے اس بات کا احساس ہوا اور بزبانِ عجز معافی کا خواستگار ہوا اور اشکبار آنکھوں سے **ربنا ظلمنا...... الخ** ورد کرنا شروع کیا۔ترجمہ: دونوں بول اٹھے کہ اے ہمارے پروردگار ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گذرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں

گے (آسان ترجمہ قرآن) اللہ کو حضرت آدمؑ کی عجز وانکساری اوراعتراف جرم پر رحم آیا اوراس غلطی کو معاف فرمایا اس کے برعکس جب ناری مخلوق ابلیس کو اُس کی غلطی پر گرفت فرمائی اور پوچھا **قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (12)** ۔سورہ اعراف آیت نمبر۱۲ترجمہ: اللہ نے کہا جب میں نے تجھے حکم دے دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ بولا میں اُس سے بہتر ہوں۔تو نے مجھے آگ سے پیدا اوراس کو مٹی سے پیدا کیا (آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی) تو اس نے بات کو طول دیا اور **خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِين** کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی اللہ کو اس کی بات ناپسند آئی اوراس مقابلہ میں خاکی خصلت آدم آگے بڑھا۔مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ افضلیت آدم کا اصل سبب یہی زاری بنی جس سے ابلیس محروم تھا ۔نماز استسقاء، افعال حج، قیام وقعود اور رکوع وسجود یہ سب عجز وانکساری کی علامتیں ہیں۔بھوک اور پیاس کی حالت میں اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا انسان کے اندر خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔جنگ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ کا پھٹے پرانے کپڑوں میں اپنے بدن کو چھپا کر آنا اور گھر کی ساری پونجی کو حضورﷺ

کے سامنے پیش کرنا فرشتوں کو اُن کی نقل اُتارنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اسی میں انسان کی اصل عظمت چھپی ہوئی ہے۔ **یوثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصہ** (سورہ الحشر آیت۹) کی مہر ایسے ہی ایثار پر ثبت کی جاتی ہے۔ پھر ایسے مسکین بندے کی باطنی کیفیت کا نقشہ شیخ عطارؒ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ ؎

من نہ خواہم مال و جاہ و طمطراق

سوز خواہم درد خواہم اشتیاق

(ترجمہ) اے اللہ میں نہ مال چاہتا ہوں نہ جاہ و حشمت بلکہ سوزِ عشق، دردِ دل اور الفت و محبت کا طالب ہوں۔

سبب فضیلت آدم اور ایک قصّہ

اللہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں فرمایا کہ **وَلَقَد کَرَمنَا بَنِی آدم** یعنی ہم نے بنی آدم کو مکرم و محترم بنایا۔ مولانا رومیؒ اسی حقیقت کے ترجمان ہیں کہ انسان کو "کرمنا" کی فضیلت اس لیے حاصل ہوئی ہے کہ اس میں بُرائی کی بھی قدرت ہے اور بھلائی کی بھی۔ انسان کی جتنی بھی تعریفیں ہوئی ہیں وہ سب اس کے اختیاری افعال پر ہیں۔ دوزخ میں جا کر دوزخی بھی عبادت کریں گے لیکن وہ اُن کی اضطراری عبادت ہوگی جو غیر معتبر ہے۔ انسان کو موجودہ وقت کی قدر کرنی چاہیے جس میں اُس سے اختیار حاصل ہے اور وہی اس کے نعمے کا سرمایہ ہے۔ جب ارادے کی قدرت باقی نہ رہے گی تو نیکی کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ مثنوی شریف دفتر سوم صفحہ نمبر ۳۱۷ میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے جانوروں کی زبان سکھا دیں۔ ایسا کرنے سے شائد میں کوئی سبق آموز نصیحت حاصل کروں۔ حضرت موسیٰؑ نے اس شخص کو نصیحت کی کہ اس قسم کی خواہش نہ کریں کیوں کہ یہ ایک خطرناک راستہ ہے اور اس میں بہت سارے خطرات ہیں۔ یہ شخص حضرت موسیٰؑ کے پیچھے پڑ گیا۔ جب حضرت موسیٰؑ عاجز ہوئے تو اللہ سے دعا کی۔ اللہ نے

فرمایا کہ اس کو جانوروں کی زبان سکھا دے۔حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اگر میں اس کو سکھا دوں گا تو آگے چل کر وہ اس کے نتائج سے شرمندہ ہوگا اور افسوس کرے گا۔کیوں کہ بااختیار اور باقدرت ہونا ہر شخص کے لیے بہتر نہیں ہوتا۔انسان کا غیر قادر ہونا انسان کو پرہیزگار بنا دیتا ہے۔جبکہ مالدار اپنے مال کے ذریعے بہت سارے گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے۔پھر اللہ کی بارگاہ سے رد کیا جاتا ہے۔مالداری کی وجہ سے بُری قسم کی خواہشات پیدا ہوجاتی ہیں اور عادتیں بگڑ جاتی ہیں۔اللہ نے فرمایا کہ یہ شخص چونکہ ضد کرتا ہے اور اپنی اس خواہش پر ڈٹا ہوا ہے لہٰذا تو اس کو جانوروں کی بولی سکھلا دے۔ تاکہ یہ ان کی باتوں کو سمجھے۔انسان کا قوتِ اختیار ہی اس کو جزاء اور سزا کا مستحق بناتا ہے۔بے اختیار کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔عبادات میں چونکہ انسان کو اختیار حاصل ہوتا ہے اس لیے اچھے اعمال کرنے والے کو ثواب عطا کیا جاتا ہے اور کائنات کی دیگر چیزوں میں چونکہ اضطرار ہوتا ہے لہٰذا اس اضطراری عبادت میں اُن کے لیے کوئی ثواب نہیں۔عاجز آکر حضرت موسیٰؑ نے اس کو مرغ اور کُتے کی بولی سکھا دی۔ صبح کے وقت وہ گھر کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔خادمہ نے اندر سے دسترخوان لاکر جھاڑا اور اس میں سے بچا ہوا روٹی کا ٹکڑا گرا۔مُرغ آیا اور وہ ٹکڑا اُچک لیا۔کُتے نے مرغ سے کہا کہ تم ظالم ہو کہ مٹی میں سے گرے پڑے دانے تلاش کرتا ہے اور میں ایسا کرنے سے عاجز ہوں۔اگر تو روٹی کا ٹکڑا چھوڑ دیتا تو اسے میں کھا کر

گذارا کر لیتا ۔ مُرغ نے کہا کہ تو پریشان مت ہو جا ۔کل آقا کا گھوڑا مرجائے گا تم دل کھول کر اس کا گوشت کھالینا۔اس شخص نے مُرغ کی بولی سمجھ لی ۔فوراً گھوڑا فروخت کیا اور مُرغ کُتے کے سامنے شرمندہ ہوا۔کیوں کہ اس کی پیش گوئی کا مظاہرہ اب ناممکن تھا۔مرغ دوسرے دن پھر روٹی کا ٹکڑا لے اُڑا۔ دوبارہ مرغ اور کتے کے درمیان وہی گفتگو ہوئی ۔مرغ نے کتے سے کہا کہ وہ گھوڑا دوسری جگہ مر گیا لیکن کل اس کا خچر مرجائے گا اور تیرا پیٹ بھر جائے گا۔ یہ سنتے ہی اس شخص نے خچر کو بھی بیچ ڈالا۔تیسرے دن پھر ایسا ہی واقع ہوا۔کُتے نے مُرغ سے کہا کہ اے جھوٹوں کے سردار تو مجھے کب تک بھوکا مارے گا۔مرغ نے کہا اس شخص نے چونکہ خچر بہت جلدی میں بیچ ڈالا لیکن اب اس کا غلام مرجائے گا۔پھر اس کے ایصال ثواب کے لیے بہت روٹیاں پکیں گی جن میں کچھ کُتوں اور مانگنے والوں میں تقسیم کی جائیں گی ۔اس شخص نے غلام کو بھی بیچ ڈالا اور یہ شخص جانوروں کی باتیں سمجھنے کی وجہ سے بہت خوش تھا کہ یہ بولیاں سیکھنے کی وجہ سے میں قضا کی آنکھ سے بچ گیا ہوں ۔ اگلے دن ٹکڑے سے محروم کتے نے کہا اُو بکواسی تو کب تک جھوٹ بولے گا ۔ مُرغ نے کہا کہ فکر نہ کر واب تک مالک اپنا نقصان دوسروں پر ڈالتا رہا لیکن اب وہ خود مرجائے گا۔کیوں کہ مال کے نقصان کی وجہ سے خدا اس کے اوپر سے بلائیں ٹالتا تھا لیکن اب جب وہ خود مرے گا تو وارث گائے ذبح کریں گے اور تجھے خوب غذا ملے گی۔

(فائدہ) اس قصے میں مولانا رومیؒ ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس شخص نے اپنے فائدے کے لیے ایک طرزِ عمل از خود اختیار کیا لیکن یہ ایک خطرناک طرزِ عمل تھا کہ جب اپنی آفتوں کو دوسروں پر ڈالتا رہا تو آخر خود ہی ہلاک ہوا۔ ورنہ اگر یہ جانوروں کی بولی سمجھنے کی استدعا اپنے اختیار سے خود نہ کرتا تو بلائیں اس کے مال پر نازل ہوتی جاتیں اور اس کی جان بچ جاتی کیونکہ "**تلف المال خلف الجان**" یعنی مال کا ضائع ہوجانا جان کی سلامتی کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن اپنے ایک اختیاری فعل کی وجہ یہ شخص آخر کار خود ہی آفت کا شکار ہوگیا۔ یہی معاملہ اس کائنات میں انسان کے ساتھ پیش آیا اللہ نے فرمایا کہ فہم وشعور عطا کرنے کے ساتھ ساتھ میں ہر انسان کو اختیار کی آزادی عطا کروں گا اور پھر اپنے ارادے سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے میں وہ بااختیار رہوگا یعنی اُسے اختیار کی آزادی ہوگی۔ اس چیلنج کو قبول کرنے پر کوئی مخلوق راضی نہ ہوئی اور سب ڈر گئے لیکن ظالم وجاہل انسان نے اس چیلنج کو قبول کیا قرآنِ کریم کی سورہ احزاب کی آیت **إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً** (ترجمہ) ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کا بوجھ اٹھا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم، بڑا نادان ہے۔

(آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی)۔میں اسی طرف اشارہ ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چلینج کے قبول کرنے میں اگر چہ بہت سارے فوائد کا امکان بھی ہے لیکن بصورتِ ناکامی ناقابلِ تلافی نقصان بھی ہے۔

اندر دریا منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت بر کنار است

ترجمہ:۔مولانا اب اس حکایت کے ذیل میں نصیحت فرماتے ہیں کہ انسان کو''کرمنا'' کی فضیلت اسی لیے حاصل ہوئی ہے کہ اُس میں بُرائی اختیار کرنے کی بھی قدرت ہے اور بھلائی کی بھی۔اگر چہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح خواں ہیں لیکن یہ ان کی اضطراری تسبیح ہے لہٰذا اس پر کوئی ثواب نہ ملے گا۔

اختیار آمد عبادت را نمک
ورنہ می گردد بناخواہ این فلک
گردشِ اُو را نہ اجر و نے عتاب
کاختیار آمد ہُنر وقتِ حساب
جُملہ عالم خود مُسبّح آمدند
نیست آں تسبیحِ جبری مُزدمند
تیغ در دستش نہ از عجزش بکَن
تا کہ غازی گردد اُو یا راہزن

زانکہ کرمنا شُد آدم زاختیار
نیم زنبور عسل نیمش مار (مثنوی صفحہ ۳۱۷ دفتر سوم)

(ترجمۂ اشعار)

(۱) اختیار، عبادت کا نمک ہے ورنہ بغیر ارادہ کے یہ آسمان بھی طواف کررہا ہے۔

(۲) اس کی گردش کا نہ ثواب ہے نہ عذاب ہے۔ کیوں کہ حساب کے وقت، اختیار معیار ہے۔

(۳) تمام عالم خود تسبیح پڑھنے والے ہیں۔ لیکن وہ جبری تسبیح اجر کا سبب نہیں ہے۔

(۴) اس کے ہاتھ میں تلوار دیدے اس کا عجز ختم کردے تا کہ وہ غازی بنے یا ڈاکو۔

(۵) اختیار کی وجہ سے بنی آدم کرمنا کا مصداق بنا۔ اس کا نصف شہد کی مکھی، نصف سانپ ہے۔ مطلب یہ کہ انسان ارادے کی آزمائش میں پھنسا ہوا ہے۔

قاموس القرآن میں لفظ ''امانت'' کی تشریح

امانة دراصل اس چیز کو کہتے ہیں جس کا کسی کو ذمہ دار اور امین بنایا جائے۔قرآن کریم إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا الیٰ اخر (ہم نے امانت کو آسمانوں پر زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا ۔ انہوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے۔مگر انسان نے اُسے اُٹھالیا) میں امانت سے کیا مراد ہے۔اس میں مختلف اقوال ہیں۔امام راغب لکھتے ہیں ''کہا گیا ہے کہ یہاں کلمہ توحید مُراد ہے۔کہا گیا ہے کہ عدالت مراد ہے۔کہا گیا ہے کہ لکھنا پڑھنا مراد ہے۔اور کہا گیا ہے کہ عقل مراد ہے۔لیکن صحیح یہ ہے کہ عقل مُراد ہے کہ اس کے وسیلہ ہی سے دوسری سب چیزیں حاصل ہوسکتی ہیں۔اور انسان کو اِسی کی وجہ سے جملہ مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں:۔امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی۔اپنی خواہش کو روک کر۔آسمان وزمین وغیرہ میں اپنی خواہش کچھ نہیں، یا ہے تو وہی ہے جس پر قائم ہیں۔انسان میں خواہش اور ہے۔اور حکم خلاف اس کے۔اس پرائی چیز (یعنی حکم) کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے اس کا انجام یہ ہے کہ منکروں کو قصور پر پکڑا جائے

۔اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے اب بھی یہی حکم ہے۔کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کردے تو بدلہ دینا پڑے گا۔اور بے اختیار ضائع ہوجائے تو بدلہ نہیں'' گویا حضرت شاہ صاحب امانت سے شریعت مُراد لیتے ہیں۔(مفردات القران وموضح القرآن)

معارف القران میں آیہ امانت کی تفسیر

تفسیر معارف القرآن میں مولانا محمد شفیعؒ سورہ احزاب آیت نمبر۲۷ کی تشریح میں لکھتے ہیں۔''اور تفسیر قرطبی میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (آسمان، زمین وغیرہ پر عرضِ امانت اور ان کے جواب کے بعد) حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب فرمایاااور فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان زمین کے سامنے پیش کی تو وہ اس کا بار اُٹھانے عاجز ہوگئے تو آپ اس بارِامانت کو اٹھائیں گے مع اس چیز کے جو اس کے ساتھ ہے،آدم علیہ السلام نے سوال کیا کہ اے پروردگار وہ چیز جو اس کے ساتھ ہے کیا ہے؟ جواب ملا کہ اگر حملِ امانت میں پورے اترے (یعنی اطاعت مکمل کی) تو آپ کو جزا ملے گی (جو اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا اور جنت کی دائمی نعمتوں کی صورت میں ہوگی) اور اگر اس امانت کو ضائع کیا تو سزا ملے گی،آدم علیہ السلام نے (اللہ

تعالیٰ کے قرب و رضا میں ترقی ہونے کے شوق میں) اس کو اُٹھایا، یہاں تک کہ بار امانت اُٹھانے پر اتنا وقت بھی نہ گذرا تھا جتنا ظہر سے عصر تک ہوتا ہے کہ اس میں شیطان نے ان کو مشہور لغزش میں مبتلا کر دیا، اور جنت سے نکالے گئے۔ آگے مولانا لکھتے ہیں کہ

عرضِ امانت کا واقعہ کس زمانے میں ہوا؟

ابھی جو روایت حضرت ابن عباسؓ کی اوپر گذری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرضِ امانت آسمان، زمین وغیرہ پر تخلیقِ آدم سے پہلے ہوا تھا، پھر جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ان کے سامنے یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ آپ سے پہلے آسمان زمین پر بھی یہ امانت پیش کی جا چکی ہے، جس کی ان کو طاقت نہ تھی اس لیے عذر کر دیا۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عرض امانت کا واقعہ میثاقِ ازل یعنی عہدِ اَلَسْتُ سے پہلے کا ہے کیونکہ عہد اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ اسی بارامانت کی پہلی کڑی اور اپنے منصب کا حلف اُٹھانے کے قائم مقام ہے۔

(ماخوذ: تفسیر معارف القرآن)

خلافت ارضی کے لیے بارِامانت اُٹھانے کی صلاحیت ضروری تھی

حق تعالیٰ نے تقدیر ازلی میں آدم علیہ السلام کو زمین میں اپنا خلیفہ بنانا طے فرمایا تھا اور یہ خلافت اسی کو سپرد کی جاسکتی تھی، جو احکامِ الٰہیہ کی

اطاعت کا بار اٹھائے، کیوں کہ اس خلافت کا حاصل ہی یہ ہے کہ زمین پر اللہ کے قانون کو نافذ کرے، خلقِ خدا کو احکامِ الٰہیہ کی اطاعت پر آمادہ کرے، اس لیے تکوینی طور پر حضرت آدم علیہ السلام اس امانت کے اُٹھانے کے لیے آمادہ ہو گئے، حالانکہ دوسری بڑی بڑی مخلوقات کا اس سے عاجز ہونا بھی معلوم ہو چکا تھا، (مظہری و بیان القرآن)

إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً (72)

''ظلوم'' سے مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے والا، اور ''جہول'' سے مُراد انجام سے ناواقف۔ اس جملے سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مطلقاً انسان کی مذمّت میں آیا ہے، کہ اس نادان نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اتنا بڑا بار اُٹھالیا، جو اس کی طاقت سے باہر تھا، مگر قرآنی تصریحات کے مطابق واقعہ ایسا نہیں، کیوں کہ انسان سے مُراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا پوری نوع انسانی، ان میں آدم علیہ السلام تو نبی معصوم ہیں، انہوں نے جو بار اُٹھایا تھا اُس کا حق بھی یقینی طور سے ادا کر دیا، اسی کے نتیجہ میں ان کو خلیفۃ اللہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا، ان کو فرشتوں کا مسجود بنایا گیا، اور آخرت میں ان کا مقام فرشتوں سے بھی بلند و بالا ہے، اور اگر نوعِ انسانی ہی مُراد ہو تو اِس پوری نوع میں لاکھوں تو انبیاء علیہم السلام ہیں اور کروڑوں وہ صالحین اور اولیاء اللہ ہیں جن پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اس امانتِ الٰہیہ کے اہل اور مستحق تھے، انھیں حقِ امانت کو ادا کرنے والوں

کی بناء پر قرآن حکیم نے نوعِ انسانی کو اشرف المخلوقات ٹھیرایا، ''ولقد کرمنا بنی آدم'' اس سے ثابت ہوا کہ نہ آدم علیہ السلام قابل مذمت ہیں نہ پوری نوعِ انسانی، اسی لیے حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ یہ جملہ مذمت کے لیے نہیں بلکہ اکثر افرادِ نوع کے اعتبار سے بیان واقعہ کے طور پر ارشاد ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ نوع انسانی کی اکثریت ظلوم وجہول ثابت ہوئی، جس نے اس امانت کا حق ادا نہ کیا، اور خسارہ میں پڑی، اور چونکہ اکثریت کا یہ حال تھا، اس لیے اس کو نوعِ انسانی کی طرف منسوب کر دیا گیا،

خلاصہ یہ ہوا کہ آیت میں ظلوم وجہول خاص ان افرادِ انسانی کو کہا گیا ہے جو احکام شرعیہ کی اطاعت میں پورے نہ اُترے اور امانت کا حق ادا نہ کیا، یعنی اُمّت کے کفار ومنافقین اور فساق و فجار اور گناہگار مسلمان، یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ، ابن جبیرؒ حسن بصریؒ وغیرہ سے منقول ہے، (قُرطبی)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ ظلوم وجہول اس جگہ بھولے بھالے کے معنی میں بطور محبانہ خطاب کے ہے کہ اس نے اللہ جلّ شانہ کی محبت اور اس کے مقامِ قرب کی جستجو میں اور کسی انجام کو نہیں سوچا، اسی طرح یہ لفظ پوری بنی نوع کے لیے بھی ہوسکتا ہے، تفسیر مظہری میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے صوفیائے کرام سے اسی طرح کا مضمون منقول ہے، لِیُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَات ''یعنی تا آنکہ عذاب دے گا اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو، اور مشرکین مردوں اور عورتوں کو، اور رحمت و

مغفرت سے نوازے گا مومنین ومومنات کو‘‘ لِيُعَذِّب میں حرف لام بیان علت وغرض کے لیے نہیں بلکہ اصطلاح عربیت کے لحاظ سے لامِ عاقبت ہے، جوکسی چیز کا انجام بیان کرے جیسے ایک عربی شعر میں ہے ؎

لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ

’’یعنی پیدا ہو موت کے لیے اور تعمیر کر ویران ہونے کے لیے‘‘۔ مُراد یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے کا انجام موت اور ہر تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔

اس جملے کا تعلق حَمَلَهَا الْإِنسَان سے ہے، یعنی انسان کے بارِ امانت اُٹھانے کا انجام یہ ہوگا کہ نوعِ انسانی میں دو فریق ہوجائیں گے، ایک کفار، منافق وغیرہ جو اطاعتِ الٰہیہ سے سرکش ہو کر امانت کے ضائع کرنے والے ہوگئے ان کو عذاب دیا جائے گا، دوسرے مؤمنین ومؤمنات جو اطاعتِ احکام شرعیہ کے ذریعہ حقِ امانت ادا کر چکے، ان کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ ہوگا،

اس آخری جملے میں بھی ظلوم وجہول کے الفاظ کی اس تفسیر کی تائید ہوئی جو اکثر ائمۂ تفسیر سے اوپر نقل کی گئی ہے، کہ یہ تمام نوع انسانی کے لیے نہیں بلکہ خاص اُن افراد کے لیے ہے جنہوں نے امانتِ الٰہیہ کو ضائع کیا ، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔ (ماخوذ از تفسیر معارف القرآن)

(فائدہ) ایسا لگتا ہے کہ بار امانت اٹھانے کا اقرار آدم سے جنت میں داخل ہونے سے پہلے لیا گیا تھا اور امانت کا اٹھانا انسان لے ایمان بالغیب کے

لیے زبردست امتحان تھا۔یعنی انسان کوئی ذمہ داری لینے کے بعد پھر اسے اچھی طرح نبھالے ۔بغیر آزمائے تو آدم کو جنت میں داخل کیا گیا لیکن وہاں اسے لغزش ہوگئی ۔ اگر اللہ چاہتا تو اسی بات پر آدم سے گرفت کرتا۔لیکن اللہ کو آدمؑ کی اس غلطی پر رحم آیا اور سنبھلنے کے لیے دنیا میں اتار کر ایک اور موقع فراہم کیا۔ورنہ اللہ پہلی غلطی پر بھی حسب وعدہ آدمؑ سے گرفت کرسکتا تھا۔لیکن یہ دوسرا اور آخری موقع فراہم کر کے اللہ نے انسان پر ایک عظیم احسان کیا۔اب جو انسان دنیا میں اس موقع کا فائدہ اٹھائے اور اپنے ارادے کو نیک اعمال کے ساتھ جوڑے وہ انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہوجائے گا اور جو اس سنہری چانس کو miss یعنی کھوئے گا وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہوجائے گا۔اس طرح اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوکر رہے گا کہ اللہ جہنم کو جن وانسان کی ایک کثیر تعداد سے بھر دے گا اور اسی طرح اپنے جلالی صفات کا اظہار کرے گا یعنی فرمانبرداروں کو جنت میں داخل کرے گا اور اپنے جلالی صفات کے تحت نافرمانوں کو جہنم میں داخل کرے گا۔

مفتی صاحب کی پوری بحث کا خلاصہ جو سمجھ میں آتا ہے اس کے مطابق تخلیق آدم کے بعد جب عرض امانت کا بوجھ اٹھانے کے لیے آدم سے مشورہ طلب کیا گیا تو آدم نے اپنی رضا سے اس بار امانت کو اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر عہد الست سے اس کا اعادہ کرایا گیا۔اس کے بعد فوراً آدمؑ کو جنت میں داخل کیا گیا۔شیطان جو اپنے اندر حسد کی آگ لیے ہوئے تھا اس

نے آدمؑ کو جنت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے لیے وسوسہ ڈالا ۔ چنانچہ قرآن حکیم میں لفظ وسوسہ ہی آیا ہے ۔ جس کا ترجمہ قاموس القرآن میں اس طرح کیا گیا ہے ''اس نے وسوسہ ڈالا ۔ اس نے دل میں برا خیال ڈالا''۔ شیطان انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی جنت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ فوراً وسوسہ اندازی کے ذریعے آدمؑ کو ممنوعہ پھل کھانے پر آمادہ کیا اور اس طرح آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا جواز قائم ہو گیا۔ اور آدمؑ کو تھوڑی مدت کے لیے ہی جنت میں ٹھہرنا نصیب ہوا۔ اور دوبارہ دنیا میں لوٹائے گئے تا کہ یہ دنیا آدمؑ اور ابلیس کے درمیان میدان جنگ بنے جو اللہ کا ازلی ارادہ تھا اور اس طرح انصاف کی بنیادوں پر نیکو کاروں کو جنت عطا کی جائے اور بدکاروں کو جہنم میں ڈالا جائے تا کہ خدا کے جملہ صفات کا اظہار ہو جائے جو اس کی ازلی مشیت تھی۔

مذکورہ موضوع کے متعلق
عصر حاضر کے مشہور مفسرین کرام کی تشریحات

(ا) مولانا مودودیؒ کی شرح ماخوذ (از) تفہیم القرآن

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَاداً ذَلِکَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (9) وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَکَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا أَقْوَاتَهَا فِیْ أَرْبَعَةِ أَیَّامٍ سَوَاء لِّلسَّائِلِیْنَ (10) ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاء وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِیَا طَوْعاً أَوْ کَرْهاً قَالَتَا أَتَیْنَا طَائِعِیْنَ (11) فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَأَوْحَى فِیْ کُلِّ سَمَاء أَمْرَهَا وَزَیَّنَّا السَّمَاء الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظاً ذَلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ 12) (سورہ حٰم السجدہ سورہ نمبر ۴۱)

(ترجمہ) اے نبی! اِن سے کہو، کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو، اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو

سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں[11] اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیّا کر دیا[12]۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے[13] پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا[14]۔ اُس نے آسمان اور زمین سے کہا ''وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو''۔ دونوں نے کہا ''ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح[15] تب اُس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دئے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا[16]۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

(حاشیہ نمبر[11]) زمین کی برکتوں سے مراد بے حد وحساب سر وسامان ہے جو کروڑ ہا کروڑ سال سے مسلسل اُس کے پیٹ سے نکلتا چلا آرہا ہے اور خورد بینی کیڑوں سے لے کر انسان کے بلند تمدّن تک کی روز افزوں ضروریات پوری کیے چلا جا رہا ہے۔ ان برکتوں میں سب سے بڑی برکتیں ہوا اور پانی ہیں جن کی بدولت ہی زمین پر نباتی، حیوانی اور پھر انسانی زندگی ممکن ہوئی۔

(حاشیہ نمبر[12]) اصل الفاظ ہیں **قَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاء لِّلسَّائِلِيْنَ** ۔ اس فقرے کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں:

بعض مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ''زمین میں اس

کے ا رزاق مانگنے والوں کے لیے ٹھیک حساب سے رکھ دیے پورے چار دنوں میں''۔یعنی کم یا زیادہ نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں۔

ابن عباسؓ، قتادہؒ اور سُدّی اِس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ''زمین میں اس کے ارزاق چار دنوں میں رکھ دیے۔ پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا۔'' یعنی جو کوئی یہ پوچھے کہ یہ کام کتنے دنوں میں ہُوا، اُس کا مکمل جواب یہ ہے کہ چار دنوں میں ہوگیا۔

ابن زید اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ ''زمین میں اُس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے چار دنوں کے اندر رکھ دیے ٹھیک اندازے سے ہر ایک کی طلب وحاجت کے مطابق۔''

جہاں تک قواعد زبان کا تعلق ہے، آیت کے الفاظ میں یہ تینوں معنی لینے کی گنجائش ہے۔لیکن ہمارے نزدیک پہلے دو معنوں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔موقع ومحل کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ بات آخر کیا اہمیت رکھتی ہے کہ یہ کام ایک گھنٹہ کم چار دن یا ایک گھنٹہ زیادہ چار دن میں نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور کمال ربوبیت اور کمالِ حکمت کے بیان میں کون سی کسر رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے اس تصریح کی حاجت ہو؟ اسی طرح یہ تفسیر بھی بڑی کمزور تفسیر ہے کہ ''پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا''۔آیت سے پہلے اور بعد کے مضمون میں کسی جگہ بھی کوئی قرینہ یہ نہیں بتاتا کہ اُس وقت کسی سائل نے دریافت کیا تھا کہ یہ

سارے کام کتنے دنوں میں ہوئے، اور یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی۔ انہی وجوہ سے ہم نے ترجمے میں تیسرے معنی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زمین میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک جس جس قسم کی جتنی مخلوق بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا تھا، ہر ایک کی مانگ اور حاجت کے ٹھیک مطابق غذا کا پورا سامان حساب لگا کر اس نے زمین کے اندر رکھ دیا نباتات کی بے شمار اقسام خشکی اور تری میں پائی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی غذائی ضروریات دوسری اقسام سے مختلف ہیں۔ جاندار مخلوقات کی بے شمار انواع ہوا اور خشکی اور تری میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور ہر نوع ایک الگ قسم غذا مانگتی ہے۔ پھر ان سب سے جدا، ایک اور مخلوق انسان ہے جس کو محض جسم کی پرورش ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بھی طرح طرح کی خوراکیں درکار ہیں۔ اللہ کے سوا کون جان سکتا تھا کہ اس کرۂ خاکی پر زندگی کا آغاز ہونے سے لے کر اس کے اختتام تک کس کس قسم کی مخلوقات کے کتنے افراد کہاں کہاں اور کب کب وجود میں آئیں گے اور ان کو پالنے کے لیے کیسی اور کتنی غذا درکار ہوگی۔ اپنی تخلیقی اسکیم میں جس طرح اُس نے غذا طلب کرنے والی ان مخلوقات کو پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اُسی طرح اُس نے اُن کی طلب کو پورا کرنے کے لیے خوراک کا بھی مکمل انتظام کر دیا۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصوّراتِ اشتراکیت کا

اسلامی ایڈیشن ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے نکالا ہے وہ سـوا ءً لـلسَّائِلِیۡن کا ترجمہ ''سب مانگنے والوں کے لیے برابر'' جرتے ہیں، اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اُٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے، لہٰذا آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے، کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہوسکتی جس کا یہ'' قرآنی قانون'' تقاضا کر رہا ہے لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین، جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنہیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے، کیا واقعی ان سب کے درمیان یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے؟ کیا فطرت کے اس پورے نظام میں کہیں آپ کو غذا کے مساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آرہا ہے؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں، جہاں انسانی ریاست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ریاست براہِ راست تقسیم رزق کا انتظام کررہی ہے، اللہ میاں خود اپنے اِس'' قرآنی قانون'' کی خلاف ورزی-------- بلکہ معاذ اللہ، بے انصافی۔۔۔۔۔فرما رہے ہیں! پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ'' سائلین'' میں وہ حیوانات بھی شامل

ہیں جنہیں انسان پالتا ہے، اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمہ ہے ۔مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر قرانی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اسی قانون کو نافذ کرنے کے لیے نظامِ ربوبیت چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے، تو کیا وہ ریاست انسان اور ان حیوانات کے درمیان بھی معاشی مساوات قائم کرے گی؟

(حاشیہ نمبر ۱۳) اس مقام کی تفسیر میں مفسرین کو بالعموم یہ زحمت پیش آئی ہے کہ اگر زمین کی تخلیق کے دو دن اور اس میں پہاڑ جمانے اور برکتیں رکھنے اور سامان خوراک پیدا کرنے کے چار دن تسلیم کیے جائیں، تو آگے آسمانوں کی پیدائش دو دنوں میں ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مزید دو دن ملا کر آٹھ دن بن جاتے ہین، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قرآن مجید میں تصریح فرمائی ہے کہ زمیں و آسمان کی تخلیق جملہ چھ دنوں میں ہوئی ہے (مثال کے طوور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم ص، ص ۳٦، ۲٦۱، ۳۲۴ جلد دُوم، ص ۴٦۰)۔ اسی بنا پر قریب قریب تمام مفسّرین یہ کہتے ہیں کہ یہ چار دن زمین کی تخلیق کے دو دن سمیت ہیں، یعنی دو دن تخلیقِ زمین کے اور دو دن زمیں کے اندر اُن باقی چیزوں کی پیدائش کے جن کا اوپر ذکر کیا ہے، اس طرح جملہ چار دنوں میں زمین اپنے سر و سامان سمیت مکمل ہو گئی۔ لیکن یہ بات قرآن مجید کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے، اور درحقیقت وہ

زحمت بھی محض خیالی زحمت ہے جس سے بچنے کے لیے اس تاویل کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ زمین کی تخلیق کے دو دن دراصل اُن دو دنوں سے الگ نہیں ہیں جن میں بحیثیت مجموعی پوری کائنات بنی ہے۔ آگے کی آیات پر غور کیجئے۔ ان میں زمین و آسمان دونوں کی تخلیق کا یکجا ذکر کیا گیا ہے اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے۔ ان سات آسمانوں سے پوری کائنات مراد ہے جس کا ایک جُز ہماری یہ زمین بھی ہے۔ پھر جب کائنات کے دوسرے بے شمار تاروں اور سیّاروں کی طرح یہ زمین بھی ان دونوں کے اندر مجرّد ایک کُرے کی شکل اختیار کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ذی حیات مخلوقات کے لیے تیار کرنا شروع کیا اور چار دنوں کے اندر اس میں وہ سب کچھ سروسامان پیدا کر دیا جس کا اوپر آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے تاروں اور سیاروں میں ان چار دنوں کے اندر کیا کچھ ترقیاتی کام کئے گئے، اُن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے، کیوں کہ نزول قرآن کے دَور کا انسان تو درکنار، اس زمانے کا آدمی بھی ان معلومات کو ہضم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

(حاشیہ نمبر ۱۴) اس مقام پر تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اوّل یہ کہ آسمان سے مراد یہاں پوری کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔

دوم یہ کہ دھوئیں سے مراد مادّے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزاء غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا ۔ موجوہ زمانہ کے سائنس داں اسی چیز کو سحابیے (Nebula) سے تعبیر کرتے ہیں اور آغازِ کائنات کے متعلق ان کا تصوّر بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے، اسی دُخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔

سوم یہ کہ ''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا'' سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ پہلے اُس نے زمین بنائی ، پھر اس میں پہاڑ جمانے ، برکتین رکھنے اور سامانِ خوراک فراہم کرنے کا کام انجام دیا ، پھر اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کائنات کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا۔اس غلط فہمی کو بعد کا یہ فقرہ رفع کردیتا ہے کہ ''اس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ اور انہوں نے کہا کہ ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح''۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس آیت اور بعد کی آیات میں ذکر اُس وقت کا ہورہا ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا بلکہ تخلیق کائنات کی ابتداء کی جارہی تھی ۔ محض لفظ ثُمَّ (پھر) کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے ہوچکی تھی ۔قرآن مجید میں اس امر کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ثُم کا لفظ لازماً ترتیب زمانی ہی کے لیے نہیں ہوتا ، بلکہ ترتیبِ بیان کے طور پر بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے ۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم ، سورۂ زمرِ

حاشیہ نمبر۱۲)

قدیم زمانے کے مفسرین میں یہ بحث مدتہائے دراز تک چلتی رہی ہے کہ قرآن مجید کی رو سے زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ایک گروہ اس آیت اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ سے یہ استدلال کرتا ہے کہ زمین پہلے بنی ہے۔ دوسرا گروہ سورۂ نازعات کی آیت ۲۷ تا ۳۳ سے یہ دلیل لاتا ہے کہ آسمان پہلے بنا ہے، کیوں کہ وہاں اس امر کی تصریح ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی تخلیق کائنات کا ذکر طبیعیات یا ہیئت کے علوم سکھانے کے لیے نہیں کیا گیا ہے بلکہ توحید و آخرت کے عقائد پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے بیشمار دوسرے آثار کی طرح زمین و آسمان کی پیدائش کو بھی غور وفکر کے لیے پیش فرمایا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ بات سرے سے غیر ضروری تھی کہ تخلیق آسمان و زمین کی زبانی ترتیب بیان کی جاتی اور بتایا جاتا کہ زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ دونوں میں سے خواہ یہ پہلے بنی ہو یا وہ، بہر حال دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے اِلٰہِ واحد ہونے پر گواہ ہیں اور اس امر پر شاہد ہیں کہ ان کے پیدا کرنے والے نے یہ سارا کارخانہ کسی کھلنڈرے کے کھلونے کے طور نہیں بنایا ہے۔اسی لیے قرآن کسی جگہ زمین کی پیدائش کا ذکر پہلے کرتا ہے اور کسی جگہ آسمان کی پیدائش کا جہاں انسان کو خدا کی نعمتوں کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ زمین کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیوں کہ وہ انسان سے قریب تر ہے۔

اور جہاں خدا کی عظمت اور اس کے کمالِ قدرت کا تصور دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ آسمانوں کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیوں کہ چرخِ گردوں کا منظر ہمیشہ سے انسان کے دل پر ہیبت طاری کرتا رہا ہے۔

(حاشیہ ۱۵) ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے طریقِ تخلیق کی کیفیت ایسے انداز سے بیان فرمائی ہے جس سے خدائی تخلیق اور انسانی صنّاعی کا فرق بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ انسان جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ اپنے ذہن میں جماتا ہے، پھر اس کے لیے مطلوبہ مواد جمع کرتا ہے، پھر اس مواد کو اپنے نقشے کے مطابق صورت دینے کے لیے پیہم محنت اور کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران وہ مواد، جسے وہ اپنے ذہنی نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے، مسلسل اس کی مزاحمت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کبھی مواد کی مزاحمت کامیاب ہوجاتی ہے اور چیز مطلوبہ نقشے کے مطابق ٹھیک نہیں بنتی اور کبھی آدمی کی کوشش غالب آجاتی ہے اور وہ اسے اپنے مطلوبہ شکل دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک درزی قمیص بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ قمیص کی صورت کا تصور اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے، پھر کپڑا فراہم کر کے اُسے اپنے تصورِ قمیص کے مطابق تراشنے اور سینے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے دوران میں اُسے کپڑے کی اس مزاحمت کا مسلسل مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ درزی کے تصور پر ڈھلنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، حتیٰ کہ کبھی کپڑے کی مزاحمت غالب آجاتی ہے اور قمیص ٹھیک

نہیں بنتا اور کبھی درزی کی کوشش غالب آجاتی ہے اور وہ کپڑے کو ٹھیک اپنے تصور کے مطابق شکل دے دیتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا طرزِ تخلیق دیکھئے ۔کائنات کا مادہ دھوئیں کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اسے وہ شکل دے جو اب کائنات کی ہے۔ اِس غرض کے لیے اُسے کسی انسان کاریگر کی طرح بیٹھ کر زمین اور چاندا ور سورج اور دوسرے تارے اور سیارے گھڑنے نہیں پڑے، بلکہ اُس نے کائنات کے اُس نقشے کو جو اس کے ذہن میں تھا بس یہ حکم دے دیا کہ وہ وجود میں آجائے، یعنی دھوئیں کی طرح پھیلا ہوا مواد اُن کہکشانوں اور تاروں اور سیاوں کی شکل میں ڈھل جائے جنہیں وہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس مواد میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اللہ کے حکم کی مزاحمت کرتا۔ اللہ کو اُسے کائنات کی صورت میں ڈھالنے کے لیے کوئی محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑی۔ اُدھر حکم ہوا اور اِدھر وہ مواد سکڑ اور سمٹ کر فرمانبرداروں کی طرح اپنے مالک کے نقشے پر ڈھلتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۴۸ گھنٹوں میں زمین سمیت ساری کائنات بن کر تیار ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کے طریق تخلیق کی اسی کیفیت کو قرآنِ مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اُسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، ص ۱۰۵،۲۵۲،۲۵۹۔ جلد دوم ، ص ۵۴۱۔۵۴۲۔ جلد سوم ص ۶۷۔ جلد چہارم، یاسین، ایت ۸۲۔ المومن، آیت

۶۸)۔

(حاشیہ۱۶) اِن آیات کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن کے حسب ذیل مقامات کا مطالعہ مفید ہوگا۔ جلد اوّل،ص ۶۱،۔ جلد دوم،ص ۴۴۱۔۴۴۲۔ ۵۰۰تا۵۰۲۔ جلد سوم، ص ۱۵۵ تا ۱۵۷۔ ۲۴۸۔۲۷۰۔ جلد چہارم، یاسین، حاشیہ نمبر ۳۷۔ الصافّات، حواشی نمبر ۵۔۶)

آیۂ امانت کی تفسیر ماخوذ از تفہیم القرآن

(71)إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً (72)لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماً (73)(سورہ احزاب سورہ نمبر ۳۳)

(ترجمہ) ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اُس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اُسے اٹھالیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۱۲۰۔ اس بارِ امانت کو اُٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں، اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول

کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔

(تشریح زیر حاشیہ نمبر ۱۲۰) کلام کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور اس حیثیت میں ہوتے ہوئے اگر وہ دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر بے فکری کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کرتا ہے تو کس طرح اپنے ہاتھوں خود اپنا مستقبل خراب کرتا ہے۔

اس جگہ ''امانت'' سے مراد وہی '' خلافت'' ہے جو قرآنِ مجید کی رُو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے، اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اسُے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرُّف کے جو اختیارات عطا کئے ہیں، اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر کا اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کئے ہیں بلکہ اللہ نے اُسے دئے ہیں، اور اُن کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اِن کو '' خلافت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہاں انہی کے لیے ''امانت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے، اِس کا تصور دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے یہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی

زبردست جسامت و متانت کے باوجود اس کے اُٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے، مگر انسان ضعیف البنیان نے اپنی ذرا سی جان پر یہ بھاری بوجھ اُٹھا لیا ہے۔ زمین و آسمان کے سامنے اس بارِ امانت کا پیش کیا جانا اور ان کا اُسے انکار کرنا اور ڈر جانا ہوسکتا ہے کہ لُغوی معنی میں ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین اور سورج اور چاند اور پہاڑ جس طرح ہمارے لیے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں، ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہی ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کرسکتا ہے اور وہ اس کو جواب دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا سمجھنا ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارِ گراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اُٹھے ہوں اور اُنہوں نے اپنے مالک و خالق سے یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو سرکار کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں اپنی خیر پاتے ہیں، ہماری یہ ہمت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اُس کا حق ادا کرسکیں اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کرسکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن

قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔اس کو دائرۂ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کرسکتا ہے جو اپنے ذہن وفکر کی استعداد کا غلط اندازہ لگا بیٹھا ہو۔

البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو اور صورتِ معاملہ کی غیر معمولی اہمیت کا تصور دلانے کے لیے اس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین وآسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ۵۔۶ فیٹ کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ:

''میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا ورغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی اطاعت کرنا چاہے تو کرے ،ورنہ وہ میرا انکار بھی کرسکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اُٹھ سکے گا۔یہ آزادی دے کر میں اُس سے اِس طرح چُھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں۔اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا، بڑی قابلیتیں عطا کروں گا،اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالادستی بخش دوں گا،تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے کرسکے۔اس کے بعد میں ایک وقت خاص پر اس کا حساب لوں گا جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہوگا اسے وہ سزا

دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے، اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پا کر بھی میری فرمانبرداری ہی اختیار کی ہوگی اسے وہ بلند مرتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ اب بتاؤ، تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں اترنے کو تیار ہے''؟

یہ تقریر سن کر پہلے تو ساری کائنات میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اُسے اِس کڑے امتحان سے معاف رکھا جائے۔ آخر کار یہ مشتِ اُستخوان اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب، میں یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اونچا عہدہ مل جانے کی جو امید ہے اُس کی بنا پر میں اُن سب خطرات کو انگیز کر جاؤں گا جو اس آزادی وخودمختاری میں پوشیدہ ہیں۔

یہ نقشہ اپنی چشم تصور کے سامنے لا کر ہی آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکرا بن کر رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ کتنی بڑی ذمہ داری کا جو بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، اور دنیا کی زندگی میں اپنے لیے کوئی رویّہ انتخاب کرتے وقت جو فیصلے وہ کرتا ہے ان کے صحیح یا غلط ہونے سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں ظلوم وجَہول قرار دے رہا ہے۔ وہ جہول ہے، کیوں کہ اس احمق نے اپنے آپ کو غیر ذمہ دار

سمجھ لیا ہے۔اور وہ ظلوم ہے، کیونکہ وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کتنے اور لوگوں کو لے ڈوبنا چاہتا ہے۔

مولانا مودودی صاحبؒ نے اپنی تشریح میں جو خیال ظاہر کیا ہے کہ ''اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے ہو رہی نوع انسانی کو اللہ تعالی نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔''

ہمیں مولانا کے امکانی وجود کے ساتھ اگر چہ اختلاف نہیں ہے لیکن اس سے پہلے ہم نے معارف القرآن کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ ''نے اللہ تعالہ کے قُرب و رضا میں ترقی ہونے کے شوق میں'' اس کو اٹھایا یہاں تک کہ بار امانت اٹھانے پر اتنا وقت بھی نہ گذرا تھا جتنا ظہر سے عصر تک ہوتا ہے کہ اس میں شیطان نے ان کو مشہور لغزش میں مبتلا کر دیا اور جنت سے نکالے گئے'' اس سے اگر چہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرض امانت کا واقعہ میثاق ازل سے پہلے ہوا تھا لیکن اسی دنیا میں الست بربکم کا وعدہ لینے سے بالکل ساتھ ہی لیا گیا تھا۔اور دونوں وعدے ساتھ ساتھ لینے کے بعد آدمؑ کو جنت میں داخل کیا گیا جہاں شیطان نے انہیں اتنی دیر بھی اپنی وسوسہ اندازی سے ٹھہرنے نہ دیا جتنی دیر کا وقفہ ظہر سے عصر کے درمیان کا ہوتا ہے ۔اس سے مجاہدؒ کی تفسیر کی تائید بھی ہوتی ہے اور آدمؑ کا جنت میں ایک عارضی مدت کے ٹھہرنے کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔

تفسیر آیۂ ''الست بربکم''

ماخوذ از مولانا مودودیؒ

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (172)أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ(173)[سورہ اعراف]

(ترجمہ) اور اے نبی ﷺ! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پُشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود اُنکے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں''؟ انہوں نے کہا ''ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں ہم اس پر گواہی دیتے ہیں'' ۔۱۳۴؎ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ''ہم تو اس بات سے بے خبر تھے''، یا یہ نہ کہنے لگو کہ ''شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا''۔۱۳۵؎ دیکھو اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔۱۳۶؎

اوراس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔۱۳۷؎

حاشیہ نمبر۱۳۴کے تحت لکھتے ہیں: جیسا کہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقع پر پیش آیا تھا۔اس وقت جس طرح فرشتوں کوجمع کرکے انسانِ اوّل کوسجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا،اسی طرح پوری نسلِ آدم کوبھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی ،اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجوداور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھااوران سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔اس آیت کی تفسیر میں حضرت اُبی بن کعب نے غالبًا نبیﷺ سے استفادہ کرکے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے۔وہ فرماتے ہیں:۔

''اللہ تعالیٰ نے سب کوجمع کیااورایک ایک قسم یاایک ایک دور کے لوگوں کوالگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کرکےانھیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی ، پھران سے عہد ومیثاق لیااورانھیں آپ اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے عرض کیا ضرورآپ ہمارے رب ہیں۔تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین وآسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تا کہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کواس کا علم نہ تھا۔خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔تم میرے ساتھ کسی کوشریک نہ ٹھیرانا۔میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جوتم کو یہ

عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود''۔

اس معاملہ کو بعض لوگ محض تمثیلی اندازِ بیان پر محمول کرتے ہیں۔ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہاں قرآن مجید صرف یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت کا اقرار انسانی فطرت میں پیوست ہے اور اس بات کو یہاں ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا یہ ایک واقعہ تھا جو عالمِ خارجی میں پیش آیا۔لیکن ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔قرآن اور حدیث دونوں میں اسے بالکل ایک واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور صرف بیان واقعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے روز بنی آدم پر حجّت قائم کرتے ہوئے اس ازلی عہد واقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے محض ایک تمثیلی بیان قرار دیں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالمِ خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فی الواقع اُن تمام انسانوں کو جنہیں وہ قیامت تک پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، بیک وقت زندگی اور شعور اور گویائی عطا کر کے اپنے سامنے حاضر کیا تھا، اور فی الواقع انہیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی رب اور کوئی الہٰ اُس کی ذاتِ اقدس واعلیٰ

کے سوا نہیں ہے، اور ان کے لیے کوئی صحیح طریقِ زندگی اس کی بندگی وفرماں برداری (اسلام) کے سوا نہیں ہے ۔ اس اجتماع کو اگر کوئی شخص بعید از امکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت میں تو نسل انسانی کی موجودہ تدریجی پیدائش جتنی قریب از مکان ہے، اتنا ہی ازل میں ان کا مجموعی ظہور، اور ابد میں ان کا مجموعی حشر ونشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحبِ عقل و شعور اور صاحبِ تصرف واختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیتِ خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت سے آگاہی بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار (Oath of allegiance) لے۔ اس معاملہ کا پیش آنا قابلِ تعجب نہیں، البتہ اگر یہ پیش نہ آتا تو ضرور قابل تعجب ہوتا۔

حاشیہ نمبر ۱۳۵ کے تحت لکھتے ہیں۔ اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسلِ آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمّہ دار قرار پائیں انھیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمّہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہوسکیں۔ گویا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازلی عہد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے

اوراس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکلّیہ بَری ہوسکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعوراور حافظہ میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغاز آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُم کا سوال ہوا تھا اور اس نے بلیٰ کہا تھا؟ اگر نہیں تو پھر اُس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور و حافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اُس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیوں کہ اس کے بعد پھر اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے، لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور (sub-conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے۔ تہذیب وتمدّن اور اخلاق ومعاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب در حقیقت انسان کے اندر بالقوۃ (Potentially) موجود

تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوۃ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم ،کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی جو اس کے اندر بالقوہ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب موثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوۃ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بالقوۃ موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت اُن چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کو ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی) تعلیم ،تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوہ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔

اب سب کے اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اُس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت ، اور خالقِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں ابھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔

اس کے مطابقِ حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو اُبھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور کتبِ آسمانی اوران کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔اسی لیے اُن کو قرآن میں مذکرِ (یاد دلانے والے) ذکر (یاد) تذکرہ (یادداشت) اوران کے کام کو تذکیر (یاددہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور

داعیانِ حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اُسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفسِ انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورتِ لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پُکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے اُبھر آیا۔

پھر اسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشاتِ نفس اور تعصّبات اور شیاطینِ جن وانس کی گمراہ کن تعلیمات و ترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، الحاد، زندقہ اور اخلاقی وعملی فساد رونما ہوتا رہا ہے لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوحِ دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر وتجدید کی کوششیں اُسے ابھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں۔جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور وحافظہ میں روزِ ازل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جبکہ انہوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر

وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے نفس ہی سے فراہم کردے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا۔اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علیٰ رؤوس الاشہاد دکھادے گا کہ انہوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اُٹھیں، اپنی اور اپنے گردوپیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیانِ حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چُھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ ابھرنے پر آمادہ ہوا، اور پھر وہ اپنے تعصّبات اور خواہشاتِ نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کردیتے رہے۔ وہ وقت جبکہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہوگا بلکہ صاف صاف اقرارِ جرم کا ہوگا۔ اسی لیے قراں مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، یعنی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا۔ وَشَهِدُوْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْ ا كَافِرِ يْن .

حاشیہ نمبر ۱۳۶ کے تحت لکھتے ہیں ''یعنی معرفتِ حق کے جو نشانات انسان کے اپنے نفس میں موجود ہیں ان کا صاف صاف پتہ دیتے ہیں۔

وماخلقت الجن والانس کی تفسیر ماخوذ از تفہیم القران

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (56)مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ (57)إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (58)سوره الذّاريات

(ترجمہ) میں نے جِنّ اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں ۵۳۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۵۴۔ اللہ تو خود ہی رزّاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست۔ ۵۵

مولانا حاشیہ نمبر۵۳ کے تحت تشریح میں لکھتے ہیں ''یعنی میں نے اِن کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ میری بندگی تو ان کو اس لیے کرنی چاہیے کہ میں اِن کا خالق ہوں۔ دوسرے کسی نے جب ان کو پیدا نہیں کیا ہے تو اُس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ اُس کی بندگی کریں، اور اِن کے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ان کا خالق تو ہوں میں اور یہ بندگی کرتے پھریں دوسروں کی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جنوں اور انسانوں ہی

کا خالق تو نہیں ہے بلکہ سارے جہان اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے، پھر یہاں صرف جنوں اور انسانون ہی کے متعلق کیوں فرمایا گیا کہ میں نے ان کو اپنے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟ حالانکہ مخلوقات کا ذرّہ ذرّہ اللہ ہی کی بندگی کے لیے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جن اور انسان ایسی مخلوق ہیں جن کو یہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہیں تو کریں، ورنہ وہ بندگی سے مُنہ بھی موڑ سکتے ہیں، اور اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری جتنی مخلوقات بھی اس دنیا میں ہیں وہ اس نوعیت کی کوئی آزادی نہیں رکھتیں۔ اُن کے لیے سرے سے کوئی دائرہ اختیار ہے ہی نہیں کہ وہ اس میں اللہ کی بندگی نہ کریں یا کسی اور کی بندگی کر سکیں۔ اس لیے یہاں صرف جنوں اور انسانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے حدود میں اپنے خالق کی اطاعت وعُبودیّت سے مُنہ موڑ کر، اور خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے خود اپنی فطرت سے لڑ رہے ہیں، اُن کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ خالق کے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں اور ان کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ جو آزادی انہیں بخشی گئی ہے اسے غلط استعمال نہ کریں بلکہ اِس آزادی کے حدود میں بھی خود اپنی مرضی سے اُسی طرح خدا کی بندگی کریں جس طرح اُن کے جسم کا رونگٹا رونگٹا ان کی زندگی کے غیر اختیاری حُدود میں اُس کی بندگی کر رہا ہے۔

عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز روزے اور اِسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح وتہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرنبرداری اور نیازمندی کے لیے پیدا نہیں کئے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجالانا، کسی اور سے تقویٰ کرنا، کسی اور کے بنائے ہوئے دین کی پیروی کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے والا اور بگاڑنے والا سمجھنا، اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳۔ الزُّمُر، حاشیہ ۲۔ الجاثیہ، حاشیہ ۳۰)

ایک اور بات جو ضمنی طور پر اس آیت سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جن انسانوں سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ اِس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو قرآن میں جِن کہا گیا ہے۔ اسی حقیقت پر قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل آیات بھی ناقابل انکار شہادت بہم پہنچاتی ہیں: الانعام، ۱۰۰، ۱۲۸۔ اعراف ۳۸، ۱۷۹۔ ہود، ۱۱۹۔ الحجر، ۲۷ تا ۳۳۔ بنی اسرائیل،

۸۸۔ الکہف، ۵۰۔ السجدہ، ۱۳۔ سبا، ۴۱۔ ص، ۵۷، ۶۷۔ حٰم السجدہ، ۲۵ ۔الاحقاف، ۱۸۔ الرحمٰن، ۱۵، ۳۹، ۵۶۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۲۱۔ النمل، حاشیہ ۲۳، ۴۵۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا حاشیہ ۲۴۔

حاشیہ ۵۴ میں لکھتے ہیں :۔ ''یعنی میری کوئی غرض جنوں اور انسانوں سے اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ یہ میری عبادت کریں گے تو میری خدائی چلے گی اور یہ میری بندگی سے منہ موڑ لیں گے تو میں خدا نہ رہوں گا۔ میں ان کی عبادت کا محتاج نہیں ہوں بلکہ میری عبادت کرنا خود ان کی اپنی فطرت کا تقاضا ہے ،اسی کے لیے یہ پیدا کیے گئے ہیں، اور اپنی فطرت سے لڑنے میں اِن کا اپنا نقصان ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں''، اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ خدا سے برگشتہ لوگ دنیا میں جن جن کی بندگی بجالا رہے ہیں، وہ سب در حقیقت اپنے ان بندوں کے محتاج ہیں۔ یہ اُن کی خدائی نہ چلائیں تو ایک دن بھی وہ نہ چلے۔ وہ ان کے رازق نہیں بلکہ الٹے یہ اُن کو رزق پہنچاتے ہیں۔ وہ اُن کو نہیں کھلاتے بلکہ اُلٹے یہ اُن کو کھلاتے ہیں۔ وہ اِن کی جان کے محافظ نہیں بلکہ اُلٹے یہ اُن کی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کے لشکر یہ ہیں جن کے بل پر اُن کی خدائی چلتی ہے۔ جہاں بھی اِن جھوٹے خداؤں کی حمایت کرنے والے

بندے نہ رہے، یا بندوں نے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا وہاں ان کے سب ٹھاٹھ پڑے رہ گئے اور دنیا کی آنکھوں نے اُن کی کس مپرسی کا حال دیکھ لیا۔ سارے معبودوں میں اکیلا ایک اللہ جل شانہٗ ہی وہ حقیقی معبود ہے جس کی خدائی اپنے بل بوتے پر چل رہی ہے، جو اپنے بندوں سے کچھ لیتا نہیں بلکہ وہی اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے۔

سورہ طلاق کی آیت نمبر ۱۲ کی تفسیر ماخوذ از تفہیم القرآن

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (12) سورہ طلاق

(ترجمہ) اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی اُنہی کے مانند۔۲۳ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تا کہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

اس آیت کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۲۳ کے تحت مولانا مودودی صاحبؒ لکھتے ہیں ''اُنہی کے مانند'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدد آسمان اُس نے بنائے ہیں ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور ''زمین کی قسم سے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین جس پر انسان رہتے ہیں، اپنی موجودات

کے لیے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی تیار کر رکھی ہیں جو اپنی اپنی آبادیوں کے لیے فرش اور گہوارہ ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو قرآن میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی پر نہیں ہیں، عالم بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔(مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشوریٰ، ایت ۲۹، حاشیہ ۵۰) بالفاظ دیگر آسمان میں یہ جو بے شمار تارے اور سیّارے نظر آتے ہیں۔ یہ سب ڈھنڈار پڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زمین کی طرح ان میں بھی بکثرت ایسے ہیں جن میں دنیائیں آباد ہیں۔

قدیم مفسرین میں سے صرف ابن عباسؓ ایک ایسے مفسر ہیں جنہوں نے اُس دور میں اس حقیقت کو بیان کیا تھا جب آدمی اِس کا تصّور تک کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ کائنات میں اس زمین کے سوا کہیں اور بھی ذی عقل مخلوق بستی ہے۔ آج اس زمانے کے سائنس دانوں تک کو اِس کے امر واقعہ ہونے میں شک ہے، کجا کہ ۱۴ سو برس پہلے کے لوگ اِسے بآسانی باور کر سکتے۔ اسی لیے ابن عباسؓ عام لوگوں کے سامنے یہ بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں اس سے لوگوں کے ایمان متزلزل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ مجاہد کہتے ہیں کہ اُن سے جب اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ''اگر میں اس کی تفسیر تم لوگوں سے بیان کروں تو تم کافر ہو جاؤ گے اور

تمہارا کفر یہ ہوگا کہ اسے جھٹلاؤ گے''۔قریب قریب یہی بات سعید بن جُبیر سے بھی منقول ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا''کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ اگر میں تمہیں اس کا مطلب بتاؤں تو تم کافر نہ ہوجاؤ گے''۔(ابن جریر۔عبد بن حُمید) تاہم ابن جریر،ابن ابی حاتم اور حاکم نے ،اورشعب الایمان اور کتاب الاسماء والصفات میں بیہقی نے ابوالضحیٰ کے واسطے سے باختلافِ الفاظ ابن اعباس کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ فِی کلِّ ارضٍ نبیٌّ کنبیّکم واٰدمُ کاٰدَمَ ونوحٌ کنوحٍ وابراھیم کابراھیم وعیسیٰ کعیسیٰ'' اُن میں سے ہر زمین میں نبی ہے تمہارے نبی جیسا اور آدم ہے تمہارے آدم جیسا اور نوح ہے تمہارے نوح جیسا ،اور ابراہیم ہے تمہارے ابراہیم جیسا اور عیسیٰ ہے تمہارے عیسیٰ جیسا۔''اس روایت کو ابن حجر نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کیا ہے۔اور امام ذہبی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے البتہ میرے علم میں ابوالضُّحٰی کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا ہے،اس لیے یہ بالکل شاذ روایت ہے۔بعض دوسرے علماء نے اسے کذب اور موضوع قرار دیا ہے اور ملا علی قاری نے اس کو موضوعاتِ کبیر (ص۱۹) میں موضوع کہتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ ابن عباس ہی کی روایات ہے تب بھی اسرئیلیات میں سے ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے رد کرنے کی اصل وجہ لوگوں کا اسے بعید از عقل وفہم سمجھنا ہے،ورنہ بجائے خود

اس میں کوئی بات بھی خلاف عقل نہیں ہے۔ چنانچہ علاّمہ آلوسی اپنی تفسیر میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس کو صحیح ماننے میں نہ عقلاً کوئی چیز مانع ہے نہ شرعاً ۔ مراد یہ ہے کہ ہر زمین میں ایک مخلوق ہے جو ایک اصل کی طرف اُسی طرح راجع ہوتی ہے جس طرح بنی آدم ہماری زمین میں آدم علیہ السلام کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اور ہر زمین میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں۔ جو اپنے ہاں دوسروں کی بہ نسبت اُسی طرح ممتاز ہیں جس طرح ہمارے ہاں نوح اور ابراہیم علیہما السلام ممتاز ہیں''۔ آگے چل کر علامہ موصوف کہتے ہیں ''ممکن ہے کہ زمینیں سات سے زیادہ ہوں اوراسی طرح آسمان بھی صرف سات ہی نہ ہوں۔ سات کے عدد پر جو عدد تام ہے، اکتفا کرنا اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس سے زائد کی نفی ہو۔'' پھر بعض احادیث میں ایک ایک آسمان کی درمیانی مسافت جو پانچ پانچ سو برس بیان کی گئی ہے اس کے متعلق علامہ موصوف کہتے ہیں کہ هو من باب التقریب لِلْاَفْهَام، یعنی اس سے مراد ٹھیک ٹھیک مسافت کی پیمائش بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصود بات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ لوگوں کی سمجھ سے قریب تر ہو۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حال ہی میں امریکہ کے رانڈ کارپوریشن (Rand Corporation) نے فلکی مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زمین جس کہکشاں (Galaxy) میں واقع ہے صرف اُسی کے اندر تقریباً ۶۰ کروڑ ایسے

سیارے پائے جاتے ہیں جن کے طبعی حالات ہماری زمین سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور امکان ہے کہ ان کے اندر بھی جاندار مخلوق آباد ہو (اکانومسٹ لندن۔مورخہ ۲۶/جولائی ۶۹ء)

’’کنت کنزاً مخفیا‘‘ کی تشریح

(از) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (12) سورہ طلاق

(ترجمہ) اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمینیں بھی اتنی ہی ۲ اترتا ہے اس کا حکم ان کے اندر ۳ تا کہ تم جانو کہ اللہ ہر چیز کر سکتا ہے اور اللہ کے علم میں سمائی ہے ہر چیز کی ۴

تشریح از حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی: حاشیہ ۲ یعنی زمینیں بھی سات پیدا کیں، جیسا کہ ترمذی وغیرہ کی احادیث میں ہے۔اُن میں احتمال ہے کہ نظر نہ آتی ہوں، اور احتمال ہے کہ نظر آتی ہوں۔مگر لوگ ان کو کواکب سمجھتے ہوں جیسا کہ مریخ وغیرہ کی نسبت آج کل حکماء یورپ کا گمان ہے کہ اُس میں پہاڑ، دریا، اور آبادیاں ہیں۔باقی حدیث میں جو اُن زمینوں کا اس زمیں کے تحت میں ہونا وارد ہے وہ شاید باعتبارِ بعض حالات کو ہو۔اور بعض حالات میں وہ زمینیں اس سے فوق ہو جاتی ہوں۔رہا ابن عباسؓ کا وہ اثر

جس میں ''اٰدمُکم کاٰدمِکم وغیرہ آیا ہے،اُس کی شرح کا یہ موقع نہیں۔'' روح المعانی''میں اس پر بقدر کفایت کلام کیا ہے۔اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے بعض رسائل میں اُس کے بعض اطراف و جوانب کو بہت خوبی سے صاف کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد مولانا اسی آیت کی تشریح کے سلسلے میں فرماتے ہیں،

حاشیہ نمبر۳''یعنی عالم کے انتظام کے تدبیر کے لیے اللہ کے احکامِ تکوینیہ و تشریعیہ آسمانوں اور زمین کے اندر اُترتے رہتے ہیں،اس کے بعد حاشیہ نمبر ۴ کے تحت مولانا لکھتے ہیں یعنی آسمان وزمین کے پیدا کرنے اوران میں انتظامی احکام جاری کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات علم و قدرت کا اظہار ہو(نبہ علیہ ابن قیم فی بدائع الفوائد)بقیہ صفات ان ہی دو صفتوں سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتی ہیں۔صوفیہ کے ہاں جوایک حدیث نقل کرتے ہیں'' کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ '' گو محدثین کے نزدیک صحیح نہیں مگراس کا مضمون شاید اس آیت کے مضمون سے ماخوذ ومستفاد ہو۔واللہ اعلم

”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ کی تفسیر

(از) مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (56) مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ (57) إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (58) (سورہ الذاریات)

(ترجمہ) اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو۔۹ میں نہیں چاہتا اُن سے روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔ اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا، زور آور، اور مضبوط۱۰

(تشریح از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) یعنی اُن کے پیدا کرنے سے شرعاً بندگی مطلوب ہے۔ اسی لیے اُن میں خلقۃً ایسی استعداد رکھی ہے کہ چاہیں تو اپنے اختیار سے بندگی کی راہ پر چل سکیں یوں ارادہ کونیہ قدریہ کے اعتبار سے تو ہر چیز اس کے حکمِ تکوینی کے سامنے عاجز اور بے بس ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب سب بندے اپنے ارادہ سے تخلیقِ عالم کی اِس غرضِ شرعی کو پورا کریں گے بہرحال آپ سمجھاتے رہیے کہ سمجھانے ہی سے یہ مطلوب شرعی حاصل ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد حاشیہ نمبر ۱۰ کے تحت لکھتے ہیں یعنی اُن کی بندگی سے

میرا کچھ فائدہ نہیں ،اُن ہی کا نفع ہے۔ میں وہ مالک نہیں جو غلاموں سے کہے میرے لیے کما کر لاؤ یا میرے سامنے کھانا لا کر رکھو۔ میری ذات ان تخیلات سے پاک اور برتر ہے۔ میں اُن سے اپنے لئے روزی کیا طلب کرتا،خوداُن کو اپنے پاس سے روزی پہنچاتا ہوں۔ بھلا مجھ جیسے زورآوراور قادروتوانا کوتمہاری خدمات کی کیا حاجت ہوسکتی ہے۔ بندگی کا حکم صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ تم میری شہنشاہی اورعظمت وکبریاء کا قولاً وفعلاً اعتراف کرکے میرے خصوصی الطاف ومراحم کے مورد و مستحق بنو

من نکردم خلق تا سودے کم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(ترجمہ از مصنف) میں نے بندوں کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ ان سے کوئی نفع حاصل کروں بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے تا کہ ان پر فضل وکرم کروں۔

زمین وآسمان کی اوراُن کے کل نظم ونسق سے کیا مقصود ہے؟

اس موضوع پر شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں بہترین تشریح فرمائی ہے۔سورہ اعراف کے رکوع نمبر۲ میں قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنظَرِیْن ۔ترجمہ:اللہ نے فرمایا تجھے مہلت دے دی گئی'' کے تحت انہوں نے حاشیہ نمبر۳ کے تحت لکھا ہے:

''یعنی جب تو نے یہ درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جائے ۔جب حکمت الٰہیہ مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ وشہنشاہانہ عظمت و جبروت کا مظاہرہ کرے تو اُس نے عالم کو پیدا فرمایا۔

(اللَّهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْماً 12)''(سورہ الطلاق رکوع۲،آیت نمبر۱۲)

ترجمہ:۔ اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے ،اور زمین بھی اُنہی کی طرح اللہ کا حکم ان کے درمیان اترتا رہتا ہے تاکہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ

کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب فرماتے ہیں ''یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور اُن کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو۔ اسی معرفت الٰہیہ کو آیت **و ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون** میں بعض سلف کی تفسیر کے موافق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ مخلوقات میں اُس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ عالم میں مطیع وفادار اور باغی و مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔ نیز اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور اُن کے پیدائشی اختیار و قوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کے آخری حد تک مہلت و آزادی دی جائے۔ پھر انجام کار حکومت الٰہیہ کا لشکر غالب ہو، دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے۔ اس کے بدون کل صفات کمالیہ کے ظاہر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پس خیر و شر اور منبع خیر و شر کا پیدا کرنا، اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے یعنی ''صفات کمالیہ کا مظاہرہ'' وہ بغیر اس کے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (118) إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْن (119) سورہ ہود آیت نمبر ۱۱۸۔۱۱۹) اسی لئے ضروری ہوا کہ عدوِ اکبر ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جائے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قویٰ و وسائل کو جی کھول کر استعمال کرلے لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ براہِ راست اُس محیط کل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی ، اس لئے ضروری ہوا کہ خدا کی طرف سے بطور نیابت وخلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے ،جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقع مل سکے۔

زمین ابلیس اور آدم کا میدان جنگ ہے

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُوراً **(64) سورہ بنی اسرائیل** (ترجمہ) اوران میں سے جس جس پر تیرا بس چلے انہیں اپنی آواز سے بہکا لے۔ اوران پر اپنے سواروں اور پیادوں کی فوج چڑھا لا، اور ان کے مال واولاد میں اپنا حصہ لگالے، اوران سے خوب وعدے کرلے۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) شیطان اُن سے جو وعدہ بھی کرتا ہے وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۳۵) (شرح محمد تقی عثمانی) آواز سے بہکانے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کے دلوں میں گناہ کے وسوسے پیدا کرے، اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد گانے، بجانے کی آواز ہے جو انسان کو گناہ میں مبتلا کرتی ہے۔

(۳۶) شیطان کو دشمن کی فوج سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس میں شریر جنات اور انسان شامل ہیں۔ یہ سب مل کر انسانوں کو بہکانے میں

شیطان کی مدد کرتے ہیں۔

(۴۷) اس میں اشارہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے مال و دولت اور اولاد کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف حاصل کرتا یا انہیں ناجائز کاموں میں استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے مال اور اولاد میں شیطان کا حصہ لگالیا ہے۔

اور پھر جب تک مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہے، خاص شاہی فوج (ملائکہ) سے اس کو کمک پہنچائی جائے اور باوجود ضعف وقلت کے مقابلہ میں مظفر ومنصور کیا جائے۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم کا میدان جنگ ہے، اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اُسی وقت ہوسکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھائے ہوں اس لئے تکویناً دو صورتیں ایسی پیش آگئیں ،جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزین ہوجائے۔ ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بناء پر نیچے گرایا گیا اور آدم علیہ السلام کو ابلیس کی وسوسہ اندازی کی بدولت جنت سے علاحدہ ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہوکر معرکہ کارزار قائم ہوگیا۔ **والحرب سجال وانما العبرة للخواتيم.**

تخلیقِ عالم کا تشریعی مقصد اور تکوینی غرض کیا ہے؟

ماخوذ از تفسیر عثمانی

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (118) إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (119)

(سورہ ہود)

(ترجمہ) اور اگر چاہتا تیرا رب کرڈالتا لوگوں کو ایک رستہ پر۔ اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں مگر جن پر رحم کیا تیرے رب نے ۳ اور اسی واسطے اُنکو پیدا کیا ہے اور پوری ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھردوں گا دوزخ جِنوں سے اور آدمیوں سے اکھٹے۔

مولانا ان آیات کے ذیل میں حاشیہ نمبر ۳ کے تحت لکھتے ہیں کہ "یعنی جیسا کہ بارہا پہلے لکھا جاچکا ہے خدا تعالیٰ کی حکمتِ تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا۔ اسی لئے حق کے قبول کرنے نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا۔ مگر فی الحقیقت اختلاف اور پھوٹ ڈالنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے صاف وصریح فطرت کے خلاف حق کو جھٹلایا۔ اگر فطرتِ سلیمہ کے موافق سب چلتے تو کوئی اختلاف نہ

ہوتا۔اسی لیے " اِلا من رحم ربک " سے متنبہ فرمادیا کہ جن پر خدا نے اُن کی حق پرستی کی بدولت رحم کیا وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں (ف۴) یعنی دنیا کی آفرینش سے غرض یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر قسم کی ''صفات جمالیہ وقہریہ'' کا ظہور ہو اس لیے مظاہر کا مختلف ہونا ضروری ہے۔ تاکہ ایک جماعت ا اپنے مالک کی وفاداری و اطاعت دکھا کر رحمت وکرم اور رضوان وغفران کا مظہر بنے۔جو " اِلا من رحم ربک " کی مصداق ہے۔اور دوسری جماعت اپنی بغاوت وغداری سے اُس کی صفتِ عدل و انتقام کا مظہر بن کر حبس دوام کی سزا بھگتے۔جس پر خدا کی یہ بات پوری ہو لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين " بہرحال آفرینش عالم کا تشریعی مقصد عبادت ہے وما خلقت الجن اولانس الا ليعبدون"(الذاریات رکوع ۳) اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب و اختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دو گروہ ایسے موجود ہوں جو حق تعالیٰ کی صفاتِ جلالیہ و جمالیہ یا بالفاظ دیگر لطف وقہر کے مورد و مظہر بن سکیں

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است
دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پھر لطف وکرم کے مظاہر بھی اپنے مدارج استعداد و عمل کے اعتبار سے مختلف ہونگے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

آیتِ امانت کی بہترین اور دلنشین تشریح

(از) مولانا عبدالحق حقانیؒ

اس آیت کے متعلق کاتب الحروف کے دل پر بھی ایک معنی القاء ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ عالم علوی سے لے کر سفلی تک ،ذرے سے آفتاب تک اسی کے ہاتھ کی کاریگری ہے اسی کے جمالِ جہاں آرا کا آئینہ ہے اُس نے اِس عالم میں کسی چیز کو بے کار پیدا نہیں کیا ہے ہر ایک شئے کو اپنی ایک صفت کا مظہر بنایا اور ہر ایک کو ایک خاص کام پر لگایا ہے۔ یہ نظامِ عالم اس بات کا مقتضی تھا کہ اس میں ایک شخص ایسا بھی ہو جو تمام عالم کا مجموعہ بن کر خدا تعالیٰ کی جمیع صفات کا مُظہر اور اُس کے جمالِ باکمال کا کامل آئینہ صافی ہو جاوے۔ پس وہ حضرت آدمؑ ہیں۔ اسی لیے صحیح بخاری میں ایک حدیث شریف آئی ہے کہ **ان اللہ خلق آدم علی صورتہٖ** کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ صورت سے مُراد سیرت ہے۔ اور اس معنی میں یہ لفظ زبانِ عرب اور ان کے اسلوبِ کلام میں بہت وارد ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ صورت وشکل سے پاک ہے۔ آیاتِ تنزیہات اس بات کی صاف گواہی دی رہی ہیں اور اسی لیے قرآنِ مجید میں جیسا کہ آیاتِ الٰہی کے ملاحظہ کے لیے آفاق کے صحیفہ کے مطالعہ کا حکم دیا ہے اسی طرح

انسان کو اپنے نفس میں غور وتامل کرنے کا حکم دیا ہے اور انہیں معنی سے انسان کو عالم کبیر کہا جاتا ہے۔ پس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آدم میں ہر ایک طرح کی قوت ودیعت رکھی ہے۔ قوتِ ادراکیہ، قوتِ غضبیہ، قوتِ رحمانیہ وغیرہا اور ان قویٰ کی ترکیب اوران کی اصلاح سے اس میں وہ وہ صفات پیدا ہوئیں کہ جو نہ آسمان وزمین کو حاصل ہے نہ جن کو نہ فرشتہ کو من جملہ اُن کے ایک دردِ دل اور محبت اور جذب ہے۔ جو کسی میں نہیں۔ یہی سوز نہانی ہے جو شب بیداروں کو رات بھر جگاتا اور صبح کو سجدہ میں سر رکھوا کر پھوٹ پھوٹ کر رُلواتا ہے اور اسی لیے شیطان نے بہت سی عبادت کر کے ایک گناہ کیا بخشا نہ گیا، برخلاف ادمؑ کے کہ اس قدر عبادت بھی نہ کی تھی اس کو فرشتوں کا مسجود بنایا گیا۔ دارالخلد میں بسایا گیا۔ ان انعامات پر گناہ کرلیا جس کی جس قدر سزا ہوتی تھوڑی ہوتی اور ابد تک بخشی نہ جاتی تو بجا تھا۔ مگر آدم کے دردِ دل نے جب اس کو جوش دلایا اور ابر کی طرح رُلایا اور منہ سے **ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا ترحمنا لنکونن من الخٰسرین.** نکلوایا تو فوراً دریائے رحمت الٰہی جوش میں آیا۔ ایک گناہ تو کیا اگر ایسے ہزار گناہ ہوتے اور زمین بھر کے ہوتے تو سب معاف ہوجاتے

واہ رے شورِ محبت خوب ہی چھڑ کا نمک
اُستخواں میرے ہُما کس کس مزے سے کھائے ہے

ملائکہ نے نہ صرف قوتیہ غضبیہ وشہوانیہ پر نظر کر کے بارِگاہِ کبریائی

میں عرض کیا تھا **اتجعل فیها من یفسد فیها** چونکہ اس مجموعۂ خوبی وگل دستۂ محبوبی کے اسرار کی خبر نہ تھی، جواب ملا **انی اعلم مالا تعلمون** کہ تم کچھ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔

پس وہ امانتِ الٰہی یہی دردِ دل ہے اور یہی اس کے قویٰ مودعہ ہیں جن کے قابل نہ آسمان وزمین تھے۔ نہ حجر وشجر نہ ملائکہ نہ کوئی اور جو اس کو لیتا ااور اس بارگراں کو اُٹھاتا یہ خلیفۃ اللہ ہی کے حصہ میں آیا اسی نے اس کو اُٹھایا اور کیوں نہ اُٹھاتا یہ اسی لیے پیدا ہوا تھا سب سے اول اسی نے سر جھکا دیا اور عرض کیا مجھے دیجے آپ دیں اور میں نہ لوں ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

انہ کان ظلوما جھولا ۔ملائکہ ودیگر لوگوں پر تعریض ہے کہ یہ وہی ہے کہ جس کو تم ظالم وجاہل سمجھتے تھے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسے بارِگراں کو اُٹھانا اور اس بلا ومحبت کو گلے میں ڈالنا دانش مند اور دور اندیش سے کب ہوسکتا ہے یہ ایسے ہی لوگوں کا کام ہے جو اپنی جان پر مصیبت گوارا کرلیں اور دور اندیشی نہ کریں ؎

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

ان آیتوں میں خدا تعالیٰ بنی آدم کو اس سرِّ نہانی کو یاد دلا کر طاعت

پرآمادہ کرتا ہے اوراس امانت کے پورا نہ کرنے کی صورت میں عتاب اور پورا کرنے میں ثواب کا وعدہ وعید فرماتا ہے۔اوراس سورت میں بیشتر احکام ہیں ان کے خاتمہ میں یہ ذکر ایک نمک ہے۔

قاموس القرآن میں اللہ کی محیّر ل العقول قدرت کی تشریح

(از: قاضی زین العابدینؒ)

یہ کائنات جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے اور ہم اس کے محدود حصے کو ہی دیکھ پاتے ہیں اس میں جاندار اور بے جان چیزیں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ انسان تمام جاندار مخلوقات میں سب سے زیادہ افضل مخلوق ہے اور اللہ نے دیگر قسم کی صدہا مخلوقات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے دیگر مخلوقا ت کو بولنے کی قوت نہیں ہے جبکہ انسان کو اللہ نے بول چال کی قوت سے نوازا ہے۔ انسان پہاڑوں کو چیرتا ہے۔ ہواؤں میں اُڑتا ہے۔ سمندروں کے اوپر جہاز اور کشتیاں دوڑاتا ہے ورنہ اپنی ذاتی قوت کے اعتبار سے انسان ان بڑی قوتوں کے سامنے ہیچ ہے۔ ہر سمجھدار انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ آخر ان تمام طاقتوں کو کون کنٹرول کر رہا ہے اور یہ کائنات بنانے سے اُس کا کیا منشاء ہے اور اس ارادہ کے پیچھے اس کی کیا مشیت چھپی ہوئی ہے جس کا اظہار وہ اس تخلیق کے ذریعے کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے اور خدا کی ذات لامحدود ہے۔ جس کی حقیقی عظمت کا تصور تک ایک ضعیف انسان نہیں کرسکتا ہے۔ اس کا اصلی منشاء سمجھنے کے لیے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ہم اُسی

خالق اور مالک کی طرف رجوع کریں اوراسی سے یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اس لیے ہمیں اُسی کی بھیجی ہوئی کتاب یعنی ''قرآن'' کی طرف رجوع کرنا ہے۔اور یہ جاننا ہے کہ وہ بذاتِ خود اس کے متعلق کیا فرماتا ہے۔ چنانچہ سورۂ فاطر کی آیت نمبر ۴۱ میں وہ خود فرماتا ہے

إِنَّ اللَّـهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا (41)

اس کا تفصیلی ترجمہ علامہ عثمانیؒ کے الفاظ میں یہ ہے یعنی''اسی (اللہ) کی قدرت کا ہاتھ ہے جو اتنے بڑے بڑے کراتِ عظام کو اپنے مرکز سے ہٹنے اور اپنے مقام و نظام سے ادھر اُدھر سرکنے نہیں دیتا۔اور اگر بالفرض یہ چیزیں اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو پھر بجز خدا کے کس کی طاقت ہے کہ ان کو قابو میں رکھ سکے''۔فوائدِ عثمانی)۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ اجرامِ سماویہ محققینِ جدید کی تحقیقات کے مطابق ،مختلف نظاموں سے وابستہ ہیں ۔ ہر چند اجرام کا علاحدہ ایک مستقل نظام ہے جس کے ماتحت وہ مصروفِ گردش رہتے ہیں۔ یہ مختلف نظام ایک دوسرے سے ہزاروں ملین سال کی رفتارِ نور کی دوری رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اجرامِ سماویہ کے بُعد کا اندازہ لگانے کے لیے ماہرینِ فلکیات نے روشنی کی رفتار کو معیار بنایا ہے۔ چنانچہ ان کے حساب کے مطابق روشنی ایک سکینڈ میں چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتی ہے ۔زمین سے جو سیارہ سب سے زیادہ قریب ہے اس کی روشنی زمین تک تقریباً

ساڑھے چار سال میں پہنچتی ہے۔لہٰذا فلکیات کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ وہ ہم سے ساڑھے چار سال نوری دور ہے۔بعض سیّارے جو زیادہ دور ہیں ان کی روشنی ہم تک ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں پہنچتی ہے)اس قدر فاصلہ کے باوجود یہ سب نظام ایک نظام اعلیٰ کے تحت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ان میں آپس میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔

ان ''نظامات سیارگاں'' میں ہی سے ایک نظام وہ ہے جس سے ہمارا تعلق ہے اور جسے نظام شمسی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔شمس (سورج) اس نظام کا مرکز ہے اور دوسرے سیارے جن میں ہماری دنیا کا سیّارہ بھی شامل ہے۔اس کے گرد اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں سورج کے گرد گھومنے والے یہ سیارے اپنے حجم اور بُعد میں مختلف ہیں ۔تاہم یہ سب اپنی مقررہ رفتار سے،اپنے مخصوص حلقہ گردش میں اس باقاعدگی کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں کہ نہ ان کی رفتار میں ایک منٹ کا فرق ہوسکتا ہے اور نہ اس کے مدار میں ایک انچ کا۔

ان سب کا اپنی اپنی معین جگہ دائر وسائر رکھنے کے لیے جو سنت الٰہیہ کام کررہی ہے اِسے اصطلاح فلکیات میں جاذبیت عامّہ کے نام سے تعبیر گیا ہے ۔اگر یہ جاذبیت ان کا صحیح توازن قائم نہ رکھے تو یہ عظیم کرات (اجرام سماویہ) ایک دوسرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہوجائیں اور کل نظام درہم برہم ہوجائے۔الغرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ خداوند جل واعلیٰ ہی کے

دستِ قدرت کی کارفرمائی ہے کہ اس نے اجرام سماویہ کے ہر نظام کی مختلف کرات عظیمہ کو اور پھر تمام نظاموں کو جن میں ہمارا نظام شمسی بھی شامل ہے۔ ایک سنت حکیمہ سے باہم مربوط و منظّم کر رکھا ہے۔ اگر اس کی قدرت وحکمت اپنا سہارا اُٹھالیں تو کائنات کی کون سی طاقت ہے جو اس کچے دھاگے کے ہار کی لڑیاں بکھرنے سے روک سکے۔ چنانچہ جب وہ ایسا کرنا چاہے گا تو ہوگا اور اسی کا نام قیامت ہے۔ اور دوسری آیہ **ویُمسِکُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضَ اِلَّا بِاِذْنِہ** (اور اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے۔ مگر جب اس کا حکم ہو تو گرے گا) میں اسی طرف اشارہ ہے بہرحال اجرامِ سماویہ کا محیر العقول نظام اہل دانش وبینش کے لیے خداوند جل وعلیٰ کی وحدانیت، اس کی عظمتِ قدرت اور اس کی وسعتِ رحمت کا بہترین نشان ہے۔ جنہوں نے اسے دل کی آنکھوں سے دیکھا وہ تو **سبُحٰن رَبِّ السَّمٰوات وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْن.** کے والہانہ نغموں میں گم ہو ہی گئے مگر جو آج اسے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ بھی بے اختیار پکار اٹھے۔ **سُبْحَانَکَ مَا اَعْظَمَ شَانَکَ !** ہندوستان کے ایک مشہور مستشرق سے، برطانوی سائنس دانوں کے استاذ الاساتذہ سر جیمس (متوفی ۱۹۴۶ء) کی ملاقات کا حال صدق جدید کی ایک تازہ اشاعت میں شائع ہوا ہے اس کے فقرے ملاحظہ ہوں۔ چائے کی میز پر بیٹھ کر سر جیمز نے اجرام فلکی کے مہیب نظام، ان کی پیچیدہ شاہراؤں، ان کی

تندئ پرواز ان کے محیرالعقول حجم اور بے کراں وسعتوں پر وہ ایمان افروز بحث کی۔اور اللہ کی عظمت و دانش پہ اس رنگ میں روشنی ڈالی کہ میں وجد و حیرت کی دوگانہ کیفیات میں کھو گیا۔اور خود سر جیمس کا یہ حال تھا کہ وہ الٰہی دانش کی دہشت سے تقریباً لرز رہے تھے۔اُن کی آنکھیں سرخ تھیں اور سر کے بال سیدھے اُٹھے ہوئے۔آخر میں فرمایا:

عنایت اللہ! خشیت و دہشت کی یہی وہ فراوانی ہے جسے کم کرنے کے لیے میں خدا کے حضور میں جاتا ہوں جب میں فرش خاک پر جبیں رکھ کر ''خدا عظیم ہے'' کہتا ہوں تو یقین رکھئے کہ یہ آواز میرے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔

عنایت اللہ: اللہ کی عظمت کا صحیح تصوّر قائم کرنے کے لیےاس کے شاہکاروں پر غور کرنے کی ضرورت ہے ایک جاہل اللہ سے ڈرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔

عنایت اللہ: سر جیمس آپ کی ان روح افروز تفاصیل کر سن کر ایک آیت کی طرف ذہن منتقل ہو گیا ہے۔اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔

سر جیمس:۔ضرور پیش کیجئے:۔

عنایت اللہ: قرآن میں وارد ہے:۔**وَاِنَّمَا یَخۡشٰی للّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمَاء** ۔(اللہ تعالیٰ سے اہل علم ہی ڈر سکتے ہیں:۔

سر جیمس: (فرط حیرت سے) کیا قرآن میں یہ آیت موجود ہے؟ محمد کو یہ راز کس نے بتایا تھا کہ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈر سکتے ہیں۔یقیناً اللہ نے

بتایا ہوگا ورنہ محمد ان پڑھ تھا۔عنایت اللہ میرا نام ان لوگوں میں شامل کرلو جو قرآن کو خدائی کتاب اور محمد کو اس کا فرستادہ سمجھتے ہیں۔اگر قرآن میں اور کچھ بھی موجود نہ ہو تو صرف یہی ایک صداقت اسے الہامی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے‘‘۔

قائم بالذات اور واجب الوجود صرف اللہ کی ذات ہے؟

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ آیت نمبر (3) سورہ الحدید

(ترجمہ) وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور مخفی تھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یعنی جب کچھ نہ تھا تو وہ تھا اور جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا۔ وہ سب ظاہروں سے بڑھ کر ظاہر ہے، کیوں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ظہور ہے اُسی کی صفات اور اُسی کے افعال اور اُسی کے نور کا ظہور ہے۔ اور وہ ہر مخفی سے بڑھ کر مخفی ہے، کیوں کہ حواس سے اس کی ذات کو محسوس کرنا تو درکنار، عقل وفکر وخیال تک اس کی کُنہ وحقیقت کو نہیں پا سکتے۔ اس کی بہترین تفسیر نبی ﷺ کی ایک دُعا کے یہ الفاظ ہیں جنہیں امام احمد، مسلم، ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے اپنی مُسنَد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے:

انت اول فلیس قبلک شئ

(تو ہی پہلا ہے، کوئی رتجھ سے پہلے نہیں)

انت الاٰخر فلیس بعدکٗ شئ

(تو ہی آخر ہے، کوئی تیرے بعد نہیں)

وانت الظاھر فلیس فوقکٗ شئ

(تو ہی ظاہر ہے، کوئی تجھ سے اوپر نہیں)

انت الباطن فلیس دونک شئ

(تو ہی باطن ہے کوئی تجھ سے مخفی تر نہیں)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اہل جنت اور اہل دوزخ کے لیے خلود اور ابدی زندگی کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ یہ بات کیسے نبھ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آخر ہے، یعنی جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا؟ اس کا جواب خود قرآن مجید میں ہی موجود ہے کہ کُلُ شَیءٍ ھَالِکٌ اِلّا وَجْھَهٗ (القصص۔۸۸) یعنی ہر چیز فانی ہے اللہ کی ذات کے سوا۔'' دوسرے الفاظ میں ذاتی بقا کسی مخلوق کے لیے نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز باقی ہے یا باقی رہے وہ اللہ کے باقی رکھنے ہی سے باقی ہے اور اس کے باقی رکھنے ہی سے باقی رہ سکتی ہے، ورنہ بذات خود اُس کے سوا سب فانی ہیں۔ جنت اور دوزخ میں کسی کو خلود اس لیے نہیں ملے گا کہ وہ بجائے خود غیر فانی ہے، بلکہ اس لیے ملے گا کہ اللہ اس کو حیاتِ ابدی عطا فرمائے گا۔ یہی معاملہ فرشتوں کا

بھی ہے کہ وہ بذاتِ خود غیر فانی نہیں ہیں۔ جب اللہ نے چاہا تو وہ وجود میں آئے۔ اور جب تک وہ چاہے اُسی وقت تک وہ موجود رہ سکتے ہیں۔

مذکورہ تشریح سے معلوم ہوا کہ اللہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہمیشہ سے قائم تھا اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ ایسی ذات جس کا وجود بذاتِ خود قائم ہو کو واجب الوجود کہتے ہیں اور جو کچھ بھی موجود ہے اُس کا بنانے والا وہی ہے لہٰذا پیدا کی گئی چیزوں کو ممکن الوجود کہتے ہیں۔

تفسیر مظہری میں عرضِ امانت کی تفسیر کا خلاصہ

عرض امانت کو آسان ترین الفاظ میں سمجھانے کے سلسلے میں قاضی صاحب نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''میں نے حضرت مجدد الف ثانی ؒ کے کلام سے یہ استفادہ کیا ہے کہ امانت تجلیات ذاتیہ کو قبول کرنے کی وہ استعداد ہے جو اللہ نے ماہیت انسانیہ میں ودیعت رکھی ہے۔ تجلیات ذاتیہ کی برداشت صرف اُسی میں ہوسکتی ہے جس کا مزاج خاکی ہو۔ اسی استعداد نے آدم کو مستحق خلافت بنایا اور یہ ہی استعداد مراد ہے اُس علم سے جس کا اظہار آیت **انی اعلم مالا تعلمون** میں کیا ہے یعنی اللہ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے کہ تجلی ذاتی کو وہ ہی برداشت کرسکتا ہے جس کا مزاج خاکی ہو۔ اسی طرف اشارہ ہے۔ لفظ **ظلوم و جھول** سے یعنی انسان کو سبعی قوت (درندہ پن) بھی دی گئی اور بہیمی قوت یعنی حیوانات مثلاً گائے بھینس کے صفات بھی۔ سبعی قوت یعنی درندہ پن کا تقاضا ہے بلند چوٹیوں پر چڑھنا۔ بلند سے بلند مراتبِ معرفت کی طرف ترقی کرتا چلا جانا اور بہیمی قوت انسان کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وصلِ محبوب کے لیے سخت ریاضتیں اور مشقتیں وہ برداشت کرسکے۔ ظلوم وجہول ہونا انسان کی صفت محمودہ ہے اور مستحق خلافت بنادینے کی علت ہے۔ سبعی اور بہیمی قوتیں ارضی مزاج رکھتی ہیں۔ سبعی اور بہیمی قوتوں کا صحیح استعمال نفع بخش اور غلط استعمال

ضرر رساں ہوسکتا ہے۔

قاضی صاحبؒ کے مذکورہ بالا ایمان افروز خلاصے کو غالباً مولانا رومیؒ کے اس شعر سے کافی تقویت مل سکتی ہے جس میں مولانا فرماتے ہیں ۔

شہوت دنیا مثال گلخن است

کہ از وحمام تقوی روشن است

ترجمہ:۔دنیاوی شہوات کی مثال کوڑے کرکٹ کی طرح ہے کہ اگر عقل مندی سے کام لیا جائے تو اسے تقویٰ کا حمام گرمایا جاسکتا ہے۔لیکن مناسب استعمال کے لیے کسی رہبر کی ضرورت ہے۔جیسے ایک ماہر حکیم زہر سے تریاق یعنی زہر کی دوائی تیار کرتا ہے اسی طرح اگر ابن آدم اپنی عقل اور ارادے کا صحیح استعمال کرے تو اس طریقے سے وہ معرفت کی منزلیں طے کر سکتا ہے ورنہ غلط استعمال سے آگ کی ایک چنگاری سے بڑی سے بڑی عمارت بھی خاکستر بن سکتی ہے۔اور یہ غلط استعمال انسان کا اپنے قوتِ ارادی کا غلط استعمال ہے جس کو وہ صحیح ڈھنگ سے بھی استعمال کرسکتا تھا۔اور انسان ارادے کے اسی صحیح اور غلط استعمال کی آزمائش کے چکر میں اس دنیا میں پھنسا ہوا ہے اور یہ آزمائش کا مرحلہ وہی لوگ سر کرسکتے ہیں جو ارادے کی آزادی کا صحیح استعمال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ورنہ یہ آزادی گلے کا پھندا بھی بن سکتی ہے اور پھر دائمی عذاب کا سبب بھی۔

الهم احفظنا منه.

نبیوں سے کیا عہد لیا گیا؟

(از) تفسیر مظہری

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقاً غَلِيظاً (7) لِيَسْأَلَ الصَّادِقِينَ عَن صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَاباً أَلِيماً (8)۔ایت نمبر ۷، ۸ سورہ احزاب

ترجمہ:۔اور اے پیغمبر ﷺ وہ وقت یاد رکھو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا اور تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ اور ہم نے اُن سے نہایت پختہ عہد لیا تھا تا کہ اللہ سچے لوگوں سے اُن کی سچائی کے بارے میں پوچھے۔ اور اس نے کافروں کے لیے تو ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''اول بات کی بابت مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ انبیاء سے جو عہد لیا گیا تھا وہ اس بات کا تھا کہ دینِ الٰہی کو قائم رکھیں۔احکام الٰہی لوگوں کو سنا دیں، خدا تعالیٰ کی رضا مندی ہر بات میں مقدم رکھیں اور باہم اتفاق اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔

واخذنا منھم میثاقاً غلیظا۔ یہ دوسرا جُملہ کوئی جدا جملہ نہیں کہ جسے عہد سمجھا جاوے بلکہ یہ پہلے جملے کی تاکید اور اس کا بیان ہے کہ وہ عہد ایسا ویسا نہیں بلکہ بڑا سخت عہد لیا تھا۔ نبی کو جب اسرار غیب کا راز داں بنایا جاتا ہے۔تو اس سے اس قسم کا سخت عہد بھی لیا جاتا ہے۔

(ف) اوّل تو جمیع انبیاء کا ذکر عام طور سے کیا کہ ہم نے ان سے عہد لیا تھا پھران میں سے پانچ نبیوں کا نام لیا جو بڑے اولوا العزم اور صاحب شریعت تھے۔اگر چہ دنیا میں حضرت کا ظہور سب نبیوں کے بعد ہو کر آپ ﷺ ہی پر سلسلۂ نبوّت تمام کر دیا گیا مگر آپ ﷺ عالم ازلی میں سب سے پہلے نبی ہیں۔چنانچہ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اس آیت کی شرح میں فرمایا ہے کہ میں سب نبیوں سے پیدا ہونے میں میں اول ہوں بھیجے جانے میں سب سے آخیر ہوں اس لیے سب سے اوّل اللہ نے میرا ذکر کیا۔اس روایت کے سلسلے میں سعید بن بشیر راوی ضعیف ہے مگر اس کی مؤید اور بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں۔

یسئل الصّادقین عن صدقھم اس عہد لینے کا نتیجہ بیان فرماتا ہے کہ اس لیے لیا گیا کہ قیامت کے دن انبیاء سے سوال کرے جو اپنے عہد کے پورا کرنے میں صادق تھے کہ تم نے اپنے کام کو پورا اور عہد اسچا کر دیا،لوگوں کو احکام پہنچائے؟ وہ کہیں گے ہاں۔اس سے منکرین کو الزام دینا مقصود ہوگا۔اور ممکن ہے صادقین سے انبیاء کی تصدیق کرنے والے

لوگ مراد ہوں کیوں کہ صادق کا مصدق بھی صادق ہے۔ اور مؤمنین بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ جنہوں نے دنیا میں اپنا عہد سچا کر دیا اور منکروں کو درد ناک عذاب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے تین عہد

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۸۱ کی تشریح کے سلسلے میں صاحب معارف القرآن نے لکھا ہے ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں، ایک کا ذکر سورہ عراف میں ''الستُ بربکم'' کے تحت کیا گیا ہے، اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے کیوں کہ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی۔

دوسرے کا ذکر واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتو کتاب لتبیننہ للناس والاتکتمونہ الخ سے کیا گیا، یہ عہد صرف اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور بیان کریں،

تیسرے عہد کا بیان اذ اخذ اللہ میثاق النبین لما اتیمکم من کتاب و حکمۃ سے کیا گیا ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (تفسیر احمدی) (بحوالہ معارف القرآن)۔

اہل کتاب سے جو میثاق لیا گیا اس کے متعلق حضرت تھانویؒ نے

اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''انبیاء علیہم السلام سے تو عہد لیا جانا قرآن مجید سے مصرح ہے۔ باقی اُن کی امم سے یا تو اُسی وقت لیا ہوگا یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے لیا گیا ہو۔ اور محل اس عہد کا یا تو اول عالم ارواح ہو یا صرف دنیا میں وحی سے لیا گیا ہو۔ اہل کتاب کو یہ عہد اس لیے سنایا کہ جب حضور ﷺ کی رسالت دلائل سے ثابت ہے تا لامحالہ اس عہد کے مضمون میں داخل ہیں۔ پھر تم پر یقیناً آپ کی تصدیق اور نصرت فرض ہے اور یہی حاصل ہے اسلام کا۔

زمین وآسمان چھ دن کے توقّف کے ساتھ وجود میں لانے کی حکمت

مثنوی شریف کے جلد سوم میں مولانا رومیؒ نے ایک صحابیؓ کا قصہ خرید و فروخت میں دھوکے سے بچنے کے لیے بطور نصیحت بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک صحابی منقد بن حبانؓ نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں کاروباری ہوں اور معاملات میں دھوکہ کھا جاتا ہوں تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم معاملہ کرتے وقت یہ کہہ دیا کرو کہ: لا خلابۃ والی الخیار ثلاثۃ ایامٍ ۔ ترجمہ دھوکہ نہ ہو مجھے تین دن تک کا اختیار ہے۔ مولانا نے

مثنوی میں ان الفاظ کے ساتھ حضورﷺ کی یہ نصیحت بیان فرمائی ہے۔

1. گفت در بیعے کہ ترسی از غرار
شرط کن سہ روز خود را اختیار

2. کہ تأنی ہست از رحمان یقین
ہست تعجیلت ز شیطانِ لعین

3. پیشِ سگ چوں لُقمہ ناں افگنی
بو کند آنگہ آخود اے مُقتنی

4. او بہ بینی بو کند ما با خِرد
رَ و بُو یش خوش بعقل منتقَد

5. با تأنی گشت موجود از خدا
تا بشش روز این زمین وچرخہا

6. ورنہ قادر بود کز کن فیکون
صد زمینو چرخ آوردے برُون

7. آدمی را اندک اندک آن ہُمام
تا چہل سالش کُند مرد تمام

8. گرچہ قادر بود کاندر یک نفس
از عدم پراں کند پنجاہ کس

9 بود عیسیٰ را دمے کز یک دُعا

بے توقُّف زندہ کردے مردُہ را

10. خالق عیسیٰؑ نہ بتو اند کہ اُو

بے توقف مرد ُم آر دتو بتو

11. ایں تأنّی از پئے تعلیم تُست

کہ طلب آہستہ باید بے شکست

12. جو یکے کو چک کہ دائم مے رَود

نے بجنش گر دد نہ گندہ مے شود

(مثنوی دفتر سوم صفحہ ۳۳۵،۳۳۶)

(ترجمہ)

۱۔ فرمایا کہ جس معاملہ میں تو دھوکے سے ڈرے تین دن کے لیے اپنے لیے خیار کی شرط کر لے۔

۲۔ کیوں کہ آہستہ روی یقیناً خدا کی جانب سے ہے۔ تیری جلد بازی ملعون شیطان کی جانب سے ہے۔

۳۔ تو جب کتے کے سامنے روٹی کا ٹکڑا ڈالتا ہے۔ اے خوشہ چین! وہ سونگھتا ہے پھر کھاتا ہے۔

۴۔ وہ ناک سے سونگھتا ہے ہم عقل سے۔ جا اس کو پرکھی ہوئی عقل سے اچھی طرح سونگھ لے۔

۵خدا کی جانب سے آہستگی کے ساتھ موجود ہوئے چھ دن میں یہ زمین اور آسمان۔

۶ورنہ وہ قادر تھا کہ کُن فیکون کے ذریعہ سینکڑوں زمین اور آسمان پیدا کر دیتا۔

۷وہ شہنشاہ آدمی کو رفتہ رفتہ اُسکے چالیس سال میں پورا مرد بناتا ہے۔

۸اگرچہ وہ قادر تھا کہ ایک دم میں عدم سے پچاس شخص روانہ کرے۔

۹حضرت عیسیٰؑ کی ایسی پھونک تھی ایک دعا سے مردے کو بلا توقف زندہ کر دیتے۔

۱۰کیا حضرت عیسیٰؑ کا پیدا کرنے والا نہیں کرسکتا کہ وہ بے توقف تہ بہ تہ انسان پیدا کر دے؟

۱۱یہ آہستہ روی تیری تعلیم کے لیے ہے اس لیے کہ طلب آہستہ اور مسلسل چاہئے۔

۱۲وہ چھوٹی سی نہر جو ہمیشہ جاری رہتی ہے (وہ) نہ تو ناپاک ہوتی ہے نہ گندہ۔

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ کے متعلق شبیر احمد عثمانیؒ کی تشریح

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّکَ مِن بَنِی آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتَ بِرَبِّكُمْ قَالُواْ بَلَى شَهِدْنَا أَن تَقُولُواْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ 172) ترجمہ اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھیوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے اُن کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب بولے ہاں ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں۔ کبھی کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔

حاشیہ نمبر۲ "میثاق خاص" کے بعد یہاں سے "میثاقِ عام" کا ذکر کرتے ہیں۔ تمام عقائدِ حقہ اور ادیانِ سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور رُبوبیتِ عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگِ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی اور انبیاء ومرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور وتأمل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول وفروع بالآخر خدا کی "ربوبیتِ عامہ" کے اسی عقیدہ پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہہ میں لپٹے ہوئے

ہیں۔عقل سلیم اور وحی والہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں۔پس ضروری تھا کہ یہ تخمِ ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبدأ و منتہیٰ اور تمام ہدایاتِ ربانیہ کا وجود مجمل کہنا چاہیے عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تا کہ ہر آدمی عقل وفہم اور وحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی و جوہری عقدہ کا حل ناخنِ عقل وفکر کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطق استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہوسکتے جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر و استدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں اس لیے قدرت نے جہاں غور وفکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی وہی اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے اُن کو فطرتاً بہرہ ور کیا،جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیل منطوی و مندرج تھی ۔اور جسکے بدون مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔یہ اُسی ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی رُبوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے۔اور جن معدودا فراد نے کسی عقلی وروحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ

خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض ،لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ و بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال ابتدائی آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیتِ کبریٰ پر عام اتفاق واجماع اس کی زبردست دلیل ہے ۔کہ یہ عقیدہ عقول وافکار کی دوادوہش سے پہلے ہی فاطرِ حقیقی کی طرف سے اولادِ آدم کو بلا واسطہ تلقین فرما دیا گیا ورنہ فکر واستدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہوجانا تقریباً ناممکن تھا۔قرآنِ کریم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اُس نے آیات حاضرہ میں عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی۔ بلا شبہ ہم کو یاد نہیں کہ اس بنیادی عقیدہ کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی۔ تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائی عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھلائے ،جس سے ترقی کرکے آج اس رتبہ کو پہنچا۔ گو پہلا لفظ سکھلانے والا اور سکھلانے کا وقت ، مکان و دیگر خصوصیاتِ مقامی بلکہ نفس سکھلانا بھی یاد نہیں۔ تاہم اُس کے موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقع ضرور ہوا ہے۔اسی طرح بنی نوع انسان کا علیٰ اختلاف الاقوام الاجیال ''عقیدہ ربیوبیت الٰہی'' پر متفق ہونا اس کی کُھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدءِ فطرت میں کسی علم کے ذریعہ سے اُن تک پہنچی ہے۔ باقی تعلیمی خصوصیات واحوال کا محفوظ نہ رہ سکنا ،اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہوسکتا۔اسی ازلی وفطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر

آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کردیا ہے۔ جو شخص اپنے الحاد و شرک کو حق بجانت قرار دینے کے لیے غفلت، بے خبری یا آبا واجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے، اُس کے مقابلہ پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرتِ انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ،بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جاسکتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور اُن سے اُن کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا۔ پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مُدعا یہ ہے کہ خدا کے ربِ مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے۔ باپ کی تقلید نہ چاہئے۔ اگر باپ شرک کرے بیٹے کو چاہئے ایمان لاوے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے سارا جہان قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

اللہ غیب میں ڈرنے والوں کی تلاش میں ہے

مولانا رومیؒ مثنوی شریف میں ایمان بالغیب کی فضیلت کے متعلق اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ

یومنون بالغیب مے باید مرا
تا بہ بستم روزنِ فانی سرا

(ترجمہ) اس شعر کا یہ ہے کہ رب العزت بندوں سے یومنون بالغیب چاہتا ہے یعنی یہ کہ اُس کے بندے اُس کی ذاتِ عالی پر غیب میں رہ کر ایمان لائیں۔ اسی لیے اُس قادرِ مطلق نے اس فانی سرا یعنی دنیا میں کھڑکیاں بند کی ہیں۔ تا کہ بندوں سے اس کا امتحان لیا جائے۔

یہ ایک بہت بڑا امتحان ہے جس کے ساتھ انسان کو اِس دنیا میں واسطہ ہے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو شخص اس امتحان میں پورا اترے گا اُس کو کائنات کے سب سے بڑے انعام سے نوازوں گا آدم کی تخلیق سے پہلے اللہ نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے بھی پوچھا تھا کہ میں کائنات میں اُس مخلوق کو اپنے سب سے بڑے انعام سے نوازنا چاہتا ہوں جو مجھ سے غیب میں رہ کر ایسے ہی ڈرے جیسے میرے سامنے ہوتے ہوئے ڈرے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اس امانت کے بوجھ کے اُٹھانے پر آمادہ ہے۔

اس غائبانہ بندگی پر قائم رہنے کے لیے اس دنیا میں میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔تمہیں ارادے کی آزادی ہوگی۔لیکن یہ اقرار کرنے کے بعد اورارادے کی آزادی عطا کرنے کے بعد میں بظاہر چھپ جاؤں گا اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ غیب میں رہ کر کون مجھ سے ڈرتا ہے اور میرے احکام پر عمل کرتا ہے تا کہ وہ میرے اس بڑے انعام کا مستحق بنے اور میں اسے ہمیشہ راضی رہوں۔تخلیق عالم کا منصوبہ اسی لیے تشکیل دیا گیا ہے۔**لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَن یَخَافُهُ بِالْغَیْب** سورہ مائدہ آیت نمبر 94

(ترجمہ) تا کہ وہ یہ جان لیں کہ کون ہے جو اسے دیکھے بغیر بھی اس سے ڈرتا ہے۔**الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَیْبِ وَهُم مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ** .سورہ الانبیاء (49)

(ترجمہ) جو دیکھے بغیر اپنے پروردگار سے ڈریں اور جن کو قیامت کی گھڑی کا خوف لگا ہو۔**إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالغَیْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاه** سورہ فاطر آیت نمبر 18

(ترجمہ) اے پیغمبر! تم ان ہی لوگوں کو خبردار کر سکتے ہو جو اپنے پروردگار کو دیکھے بغیر اس سے ڈرتے ہوں،اور جنہوں نے نماز قائم کی ہو۔

إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَن بِالْغَيْب سوریاسین آیت نمبر 11 (ترجمہ) تم تو صرف ایسے شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت پر چلے ،اور خدائے رحمان دیکھے بغیر اُس سے ڈرے۔مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَن

بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ۔(سورہ ق)(33)(ترجمہ)جوخدائے رحمان سے اُسے دیکھے بغیر ڈرتا ہواور اللہ کی طرف رجوع ہونے والا دل لے کرآئے۔وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ (سورہ حدید آیت نمبر 25)(ترجمہ)اور یہ اس لیے تا کہ اللہ جان لے کہ کون ہے جو اس کو دیکھے بغیر اس (کے دین) کی اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتا ہے۔إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۔ سورملک(12) (ترجمہ)جولوگ بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے بے شک مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

قرآن پاک کے شروع میں ہی اللہ نے فرمایا کہ متقی وہی لوگ ہیں جو **الذین یومنون بالغیب** (سورہ البقرہ ایت نمبر۳) (ترجمہ)''جو بے دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ان سب آیات سے صرف اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ اس دنیا میں ایمان بالغیب کا امتحان لیا جانا مقصود ہےاور واقعی ایسا انسان سونے کا کُندن(Pure Gold) ہے جو ظاہر و باطن دونوں میں یکساں طریقے سے خدا سے ڈرنے والا ہو۔اسی لیے سب سے پہلے تمام انبیائے کرام نے ایمان بالغیب کی دعوت چلائی اور صحابہ کرامؓ بھی فرماتے ہیں کہ **تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن** یعنی ہم اصحاب محمدﷺ نے سب سے پہلے ایمان سیکھا اور اس کے بعد قرآن۔

اگر خدا کا کوئی بندہ **الست بربکم** کا فرمان سن کر اور **قالو بلیٰ**

کے الفاظ میں اقرار کرنے کے بعد اُس وعدہ سے مُکر جائے گا تو اس کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا عذابِ شدید تیار کر کے رکھا ہے جیسا عذاب اُس نے اِس وقت تک کسی مخلوق کو نہیں دیا ہے۔ اُسی عذاب کا نام جہنم ہے۔ جس کو سُن کر جملہ کائنات اس امانت کے بوجھ کو اُٹھانے سے لرز اُٹھی جو اس امتحان میں ناکامی کی صورت میں اس کے ساتھ جڑی ہوئی تھی لیکن انسان نے انعام کی لالچ میں امانت کا یہ بوجھ اُٹھانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اگرچہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اس امانت کے بوجھ کو اُٹھانے میں یقیناً کامیاب ہو گئے مگر اکثر لوگ امانت کے اس بوجھ کو اُٹھانے میں لاپرواہی کا شِکار رہوئے اور اُن ہی کے متعلق قرآن میں ظلوماً جہولا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور جو اپنے اس کئے گئے وعدے پر قائم رہے وہی لوگ اللہ کے ایسے بندے ہیں جنہیں اللہ روزِ محشر اپنے سب سے بڑے انعام سے نوازے گا یعنی اپنی رضامندی اور دخولِ جنت سے۔ اے اللہ ہمیں ان دونوں کامیابیوں سے سرفراز فرما۔ آمین۔

موضوع کی مناسبت سے
چند سوالات اوران کا جواب

سوال نمبر۱ تخلیق عالم سے کیا مقصود ہے؟اور یہ بات قرآنِ کریم کی کس آیت سے ثابت ہے؟

(جواب)عالم کو بنانے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کے تمام صفاتِ کمالیہ(چاہے وہ جمالی ہوں یا جلالی) کا اظہار ہو جائے اور اللہ کے بندوں کو اس کی معرفت یعنی پہچان حاصل ہوجائے۔یہ بات قرانِ شریف کی سورہ طلاق کی آیت نمبر۱۲سے ثابت ہے۔

سوال نمبر۲ سورہ طلاق کی آیت نمبر۱۲اور اسکا ترجمہ کیا ہے؟

(جواب) **اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰہَ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَأَنَّ اللّٰہَ قَدْ أَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْماً 12)**

(ترجمہ)اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے،اور زمین بھی ان ہی کی طرح۔اللہ کا حکم ان کے درمیان اتر تا رہتا ہے تا کہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ

اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے(آسان ترجمہ قرآن از مفتی محمد تقی عثمانی)
اس آیت کریمہ کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ ''یعنی آسمان وزمین کے پیدا کرنے اوران میں انتظامی احکام جاری کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات علم وقدرت کا اظہار ہو۔(نبّہ علیه انم قیم فی بدائع الفوائد)بقیہ صفات ان ہی دوصفتوں سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتی ہیں۔صوفیاء کے ہاں جوایک حدیث نقل کرتے ہیں ''کُنتُ کنزاً مخفیاً بحببتُ ان عرف ''گو محدثین کے نزدیک صحیح نہیں مگراس کا مضمون شائد اس آیت کے مضمون سے ماخوذ و مستفاد ہو۔ واللہ اعلم۔مولانا رومیؒ اسی مضمون کا مفہوم اپنے اس شعر میں بیان فرماتے ہیں ۔

بہر اظہار ہست ایں خلقِ جہاں
تا نہ ماندِ گنجِ حکمتہا نہاں

(ترجمہ)اسی بات کو سمجھانے کے لیے دنیا بنائی گئی تاکہ حکمت کے خزانے پوشیدہ نہ رہیں یعنی ان کا اظہار خدا کے بندوں پر ہو۔

سوال نمبر۳ اس کا عملی مظاہرہ کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب:اس کا مظاہرہ تب ہی ہوسکتا ہے جب عالم میں مطیع ووفادار اور باغی و مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔

سوال نمبر۴ اللہ کے صفاتِ کمالیہ کے ظاہر ہونے کی کون سی مبنی بر انصاف صورت اللہ کی اس مشیّت کو روبہ عمل لاسکتی ہے؟

(جواب) ایسی صورتِ حال کو روبہ عمل لانے کے لئے آسان صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار کو قوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت و آزادی دی جائے، پھر انجام کار حکومت الٰہیہ کا لشکر غالب ہو۔ دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے۔

سوال نمبر۵ اللہ نے خیر وشر یعنی دونوں کو کیوں پیدا کیا اور اس میں کیا حکمت ہے؟

(جواب) خیر وشر کو پیدا کرنے کی حکمت یہ ہے تا کہ اللہ کی صفات کمالیہ کا مظاہرہ ہو وہ بغیر اس کے پوری نہ ہوسکتی تھیں۔ یہ مصور کا کمال ہے کہ وہ اچھی اور بُری صورت بنانے پر پوری قدرت رکھتا ہو۔

سوال نمبر۶ شر کا منبع کس کو بنایا اور وہ کون تھا؟

(جواب) شر کا منبع ابلیس لعین کو بنایا اور وہ جنّات میں سے تھا۔

سوال نمبر۷ ابلیس لعین کو وجود بخشنے کے بعد کتنی مہلت اور آزادی واختیار دیا گیا؟

(جواب) ابلیس کو آزادی و اختیار دیا گیا تا کہ وہ قیامت تک اپنے قویٰ و وسائل کو جی کھول کر استعمال کرے اور اس طرح اس پر اللہ کی حجت پوری ہو۔اور اس کی اتباع کرنے والوں پر بھی اللہ کی حجت قائم ہو۔

سوال نمبر۸ ابلیس اپنی اصلی خصلت ظاہر کرنے کے لیے بذات خود خدا کے

مقابلہ میں کیوں نہ آیا؟

جواب:۔ کیوں کہ ابلیس کے لیے براہِ راست اُس محیط کُل اور قادر مطلق سے ٹکر لینا ممکن نہ تھا۔

سوال نمبر۹ اس کا ازالہ اللہ نے کیسے کیا؟

(جواب) خدا نے اپنی طرف سے بطور نیابت و خلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقعہ مل سکے۔

سوال نمبر۱۰ جب کچھ بھی نہیں تھا تب کیا تھا؟

(جواب) جب کچھ بھی نہیں تھا تب صرف اللہ کی ذات تھی۔

سوال نمبر۱۱ کسی چیز کے بغیر اللہ نے کائنات کو کیسے پیدا کیا؟

(جواب) اللہ کے پاس ایسی زبردست قدرت اور علم ہے کہ وہ چیزوں کو غیب سے پیدا کر سکتا ہے۔

سوال نمبر۱۲ غیب سے چیزوں کو پیدا کر کے انسان کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کیوں کیا؟

(جواب) یہ بات بھی سورہ طلاق کی آخری مذکورہ آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ اور علم محیط کا اظہار کرنا چاہا جو اس کی ذات کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

سوال نمبر۱۳ اس کاروائی کا آغاز اللہ نے کیسے کیا؟

(جواب) اس کے لیے اللہ نے اپنے حکم ''کن'' سے کام لے کر سب سے پہلے زمین و آسمان اور ان کے ساتھ مربوط دیگر چیزوں کو بنایا مثلاً تارے، سیارے، پہاڑ سمندر وغیرہ۔

سوال نمبر ۱۴۱ ''امر کن'' سے کیا مُراد ہے؟

(جواب) امر کُن سے مُراد ہے بنانا کسی چیز کا کسی دوسرے چیز کی مدد کے بغیر یعنی

"To create a thing without the help of any other thing A supper natural power which is lying only with God. He says it be and it is."

سوال نمبر ۱۵۱ خادم الحرمین کی نگرانی میں شائع شدہ انگریزی تفسیر کے صفحہ نمبر ۱۳۳۸ پر امر کن کی وضاحت کس طرح کی گئی ہے؟

جواب:۔ وہاں ان الفاظ میں اللہ کے امر کن کی تشریح ملتی ہے:

"And His creation is not dependent on time or instruments of means, or any condition withsoever. existance waits on His will, or Plan, or Intension. The movement He wills thing, it becomes. His word, or command, and the thing forthwith comes into existence"

سوال نمبر ۱۶: اللہ کو اپنی صفات ظاہر کرنے کے پیچھے کیا مشیت تھی؟

(جواب) مشیت یہ تھی کہ پوری کائنات میں اپنے نیک بندوں کو سب سے بڑے انعام سے نواز دے اور نافرمان بندوں کو سب سے بڑا عذاب دے۔ یعنی اپنے جمالی اور جلالی صفات کا اظہار کرے۔

سوال نمبر ۱۷: جمالی صفات کے اظہار سے کیا مُراد ہے؟

(جواب) جمالی صفات سے مُراد Manifestation of divine mercy and benefecience یعنی شانِ کریمی کے تحت بندوں پر احسان، کرم، بخشش اور فیاضانہ سخاوت ۔ جس میں بندوں سے ہمیشہ کے لیے راضی ہونا اور جنت ک اعلیٰ نعمتوں سے نوازنا بھی شامل ہے۔

سوال نمبر ۱۸: کیا اللہ کی کمالِ قدرت کا اظہار جمالی صفات کے اظہار سے ہی نہیں ہوسکتا تھا؟

(جواب) نہیں ۔ چونکہ اللہ اپنی کمالِ قدرت کے ساتھ دیگر اوصاف کے ساتھ بھی متصف ہے لہٰذا ان کا اظہار بھی ضروری تھا۔

سوال نمبر ۱۹: وہ دیگر صفات کیا ہیں؟

(جواب) وہ دیگر صفات اس طرح ہیں کہ وہ ظلم کا قلع قمع کرنے کے لیے قہاریت All powerful or overpowering کی صفت کا مالک بھی ہے، تاکہ بوقت ضرورت ظالموں اور جابروں پر قہر کرے۔

سوال نمبر ۲۰: اس صورتِ حال کو روبہ عمل لانے کے لیے کون سا منصوبہ تشکیل

دیا۔

(جواب)ان دونوں صفات اور دیگر صفات کے اظہار کو روبہ عمل لانے کے لیے اللہ نے دنیا کو بنایا جہاں انسان کو ان صفات کا نشانہ بنانے کے لیے امتحان لینا مقصود تھا۔ اور اس طرح دنیا کو خود ہی اپنے بندوں کے لیے دارالامتحان بنایا اور اس امتحان میں جو شخص جس قسم کی کارکردگی بجالائے گا اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ روا رکھا جائے گا۔ گویا اس کی عین کارکردگی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔

سوال نمبر ۲۱ اگر کائنات کی ہر چیز پر صرف اسی کا کنٹرول ہے تو انسان کا کوئی عمل اس کی سزا کا باعث کیوں بنے؟

(جواب) بے شک اللہ کا کنٹرول ہر شئے پر ہے لیکن انسان کے ساتھ اس کا ایک الگ اور خصوصی معاملہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو ارادے کی آزادی دی گئی ہے جبکہ کائنات کی کسی دیگر شئے کو ارادے کی آزادی نہیں دی گئی ہے ایک انسان دنیا کی اس مختصر زندگی میں جو بھی کام کرنا چاہے اس کی اُس کو آزادی عطا کی گئی ہے۔ لیکن اس پر صرف یہ الزام عائد ہوگا کہ سمجھانے کے باوجود اس نے اپنے ارادے کو اُس کام کے ساتھ کیوں جوڑا جس سے دنیا کے اندر نافرمانی اور بگاڑ کا ماحول پیدا ہوا۔ اور اگر وہ اپنے ارادے کو کسی اچھے عمل سے جوڑے گا تو اس کے بدلے اُسے انعام سے نوازا جائے گا۔ اسی قوتِ ارادی کو انگریزی زبان میں Will Power کہتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۲: ارادے کی قوت کے ساتھ جو دیگر قویٰ انسان کو عطا کئے گئے ہیں ان کی ایک مختصر سی تفصیل کیا ہے؟ اتنی قوتوں سے نوازنے کے بعد انسان کے پاس نافرمانی کرنے کا کیا کوئی بہانہ باقی رہ جاتا ہے؟

(جواب) قوتِ ارادی کے ساتھ جن قویٰ سے اللہ نے بندوں کو نوازا ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے:

قوتِ باصرہ(Sence of sight)

قوتِ باہ(Potency)

قوتِ جاذبہ(Power of absorption)

قوتِ دافعہ(Power of expulsion)

قوت سامعہ(The faculty of hearing)

قوتِ ذائقہ(Sence of taste)

قوتِ شامہ(Sence of smell)

قوتِ غضبیہ(Passion , fury)

قوتِ ماسکہ(Power of retention)

قوتِ متخیلہ(Faculty of Imagination)

قوتِ مدرکہ **(Faculty of perseption or Apprehension)**

قوتِ متفکرہ(Faculty of thought)

قوتِ ممیّزہ(Faculty of Discrimination)

قوتِ نامیہ (Faculty of Growth)

قوتِ ہاضمہ (Digestive Power)

قوتِ مولدہ (Generative Faculty)

اتنی عظیم الشان قوتوں سے نوازنے کے بعد انسان کے پاس نافرمانی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا ہے جب کہ ان قویٰ کا صحیح استعال کرنے کے لیے اللہ نے انسان کی راہبری کے لیے اپنے بندوں میں سے ہی کچھ خاص بندے چُن لئے جنہوں نے ہر دور میں انسان کو صحیح راہبری کی کہ وہ اللہ کی عطا کردہ ان قوتوں سے کس طرح اپنے آپ کو سنوار سکتا ہے اور ان کا غلط استعمال کر کے اپنے آپ کے لیے تباہی کا کتنا بڑا سامان جمع کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کو ان عظیم الشان قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین۔

سوال نمبر ۲۳: وہ کون سا انعام ہے جس سے فرمانبراد بندوں کو نوازا جائے گا اور وہ کون سا عذاب ہے جس میں نافرمان بندوں کو ہمیشہ کے لیے مبتلاء کیا جائے گا؟

(جواب) انعام تو جنت ہے جہاں انسان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ اور عذاب جہنم ہے جہاں سخت قسم کی آگ میں انسان ڈالا جائے گا۔ اس سے بڑھ کر انعام یہ ہے کہ خدا بندے سے ہمیشہ کے لیے راضی رہے گا اور جنت میں بندوں کو اللہ کی زیارت نصیب ہوگی۔ اے اللہ امت مرحومہ کی مغفرت فرما۔ زندوں کو ہدایت نصیب فرما اور ہم سب کو تیری رضا اور جنت نصیب فرما۔ آمین

خلاصة الکتاب

اللہ نے ابتداء میں تمام مخلوق کو پیدا کر کے سامنے لایا ان سے مخاطب ہوا اور کئی ایک باتوں سے پردہ اُٹھایا۔اللہ نے اپنا ایک ارادہ ظاہر کیا کہ میں اپنی ذات کو چھپانا چاہتا ہوں ۔اور ظاہر میں کسی کو نظر نہیں آؤں گا یہاں تک کہ کسی کو بظاہر کھلے طریقے سے پتا نہ چلے گا کہ کون مالک ہے اور کس کا مالک ہے۔مخلوق کو بظاہر دور رہنا ہوگا جیسے وہ ایک اندھیرے میں ہیں لیکن انہیں اس ظلمت کو مٹانا ہوگا اور میں گھات لگا کر ان کا نظارہ کر رہا ہوں گا۔لیکن ان کا کمال یہ ہوگا کہ وہ مجھے اس گھات میں رہنے کے باوجود دریافت کریں۔اس بات کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے سنا۔خدا کے اس اعلان کو جنوں اور انسانوں نے بھی سنا۔سبھوں کے سامنے اپنی مشیّت ظاہر کر کے ایک بڑی خوشخبری سے بھی اپنی مخلوق کو آگاہ کیا کہ جو مخلوق چھپ کر رہنے کے باوجود مجھے دریافت کرے اس کو میں کائنات کے سب سے بڑے انعام سے نوازوں گا ۔ اللہ کا یہ اعلان زمینوں، آسمانوں، پہاڑوں اور غیر متحرک اشیاء نے سنا۔جنوں اور انسانوں نے سنا۔لیکن انسان کے بغیر سبھوں نے نہایت ہی ادب سے عرض کیا کہ اے اللہ کون ہے جو ایسی بے جا جرأت کرے۔ایک طرف آپ اُسے چھپ کر ہی روزی عطا

کریں گے اوراس پر کوئی بھی چاہے اچھا ہو یا بُرا یعنی کچھ بھی کرنے کی اس کو آزادی ہوگی ایسی صورتِ حال میں پھنس کر یہ ایک نہایت ہی مشکل امتحان ہوگا اس میں پھنسنا ہماری صبر اور طاقت سے باہر ہے۔سبھوں نے اپنے مہربان دوست یعنی اللہ سے اس قسم کی جدائی کو برداشت کرنے کے متعلق اپنا اپنا عذر پیش کیا اور مدنظر یہی بات تھی کہ اگر پیدا کرنے والا ہی چھپ کر رہے گا تو اُس کو ڈھونڈنا کس کے ہمت کی بات ہے۔اللہ تعالیٰ کی یہ زبردست تقریر سن کر صرف انسان آگے بڑا اور کائنات کے سب سے بڑے انعام کی لالچ میں آکر آزمائش کے اس بوجھ کو اُٹھانے پر تیار ہوا۔اللہ کی اس مشیت پر انسان کا آگے بڑھنا اور اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھانے کی ذمہ داری لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔اس پر اللہ نے دیگر مخلوقات کے سامنے ایک طرح سے فکریہ انداز میں کہا کہ لو جی یہ بندہ میری مشیت کا خریدار ہے لیکن ذمہ داری لے کر اگر ابن آدم اس کو نبھانے میں کامیاب نہ ہوا تو اُس کے پیشِ نظر اس کو ظلوماً جھولا کے خطاب سے بھی نوازا۔کیوں کہ آقا سے دور پڑ کر تاریکیوں میں بھٹکنا کوئی معمولی عہد و پیمان نہیں تھا اور پھر ان اندھیریوں میں بھٹک کر اپنے آقا کو تلاش کرتے رہنا کوئی کھیل تماشا نہیں تھا۔اُس کے خوف کو دل میں بٹھاتے ہوئے اس کے وعدوں پر جیتے ہوئے زندگی گزارنا جان جھوکوں کا کام تھا لیکن انسان چونکہ اس قسم کی پُر خطر ذمہداری سر پر لینے کے لیے تیار ہوا لہٰذا اللہ نے انسان کو اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ اب تجھے اس دیگر پیدائش پر فوقیت حاصل ہے۔اوران سب کو

تیری ماتحتی میں رکھوں گا اور سب دیگر مخلوقات تمہاری تابع ہو گی اس کو مخول نہیں سمجھنا۔ انسان کو خبر دار کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ میری تلاش اور جستجو کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور اگر ایسا کرو گے تو تمہیں آگ میں جلا دوں گا۔ بگاڑ کا طور طریقہ اختیار نہ کرنا۔ میری مصنوعات کو خدا کا درجہ نہ دینا مثلاً چاندی، سونا، سورج اور چاند وغیرہ۔ میرا شریک کسی کو نہ بنانا۔ انسان نے اس سب پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اللہ نے ساری دیگر مخلوقات کو اس پر گواہ بنایا۔ انسان سے پہلے چونکہ ملائکہ وجود میں آئے تھے اور خاموشی کے ساتھ اللہ کی تابعداری میں مصروف تھے۔ انہوں نے شور اُٹھایا۔ کہ اے اللہ کہیں یہ مٹی کا پتلا دنیا کو آلام ومصائب سے نہ بھر دے اور فساد برپا نہ کرے۔ ہم چونکہ حضور کے غلام نہایت ہی مطیع وفرمانبردار ہیں لہٰذا ہم کو ہی ذکر وفکر کی اس ڈیوٹی پر معمور فرما دیجئے جو ہم بہت پہلے سے جناب کی بارگاہ میں انجام دے رہے ہیں۔ فرشتوں کا یہ خدشہ چونکہ بالکل بے حقیقت بھی نہ تھا کیوں کہ بعد میں سبھوں نے دیکھا کہ واقعی انسانیت کے مختلف ادوار میں انسانوں کی اکثریت نے دنیا کو خون خرابے سے بھر دیا لیکن فرشتے چونکہ اللہ رب العزت کے اصل منشاء سے باخبر نہ تھے۔ وہ انسانوں کو اور ان کے افعال واطوار کو ان کی اکثریت کے لحاظ سے دیکھ رہے تھے اس پر اللہ نے فرمایا کہ تم اس بات کو نہیں جانتے ہو جو میں جانتا ہوں۔ انسانوں کا اتنا بڑا ہجوم اصل میں ہمارا مطلوب نہیں ہے بلکہ چُن چُن کر صرف وہی افراد مطلوب ہیں جو اس آزمائش میں پورے اُتریں گے اور بظاہر میری غیر موجودگی میں

میرا خوف اور مجھ ہی سے امید باندھ کر خلافت و نیابت کا بوجھ اُٹھائیں گے ان کو ہی چُن چُن کر جنت میں پہنچانا مطلوب ہے اور جو ظاہر میں تو اس وقت اس امانت کے بوجھ کو اُٹھانے کا وعدہ کر رہے ہیں اور پھر اپنے وعدے سے بے فکر بن جائیں گے ان کو اُن کے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی رہوں گا اور اس طرح اپنی مشیت کو پورا کروں گا کہ صالحین سے جنت سجاؤں گا اور بغاوت کرنے والوں کو اپنی شان قہاریت کے تحت جہنم رسید کروں گا۔ لہٰذا جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے ہو اور آپ کو بجز رضا و تسلیم کے آگے بڑھنے کی جسارت نہ کرنی چاہیے۔ صالحین اور غیر صالحین کا سارا منظر اس دُنیا میں مشاہدہ کر کے جب میں چاہوں گا تب اِس دنیا کو زیر و زبر کروں گا اور اپنی جمالی و جلالی شان کا اظہار کروں گا۔ خدا کی یہ تقریر سن کر کائنات کا ذرّہ ذرّہ حیرت میں ڈوب گیا۔ کائنات کے خالق و مالک نے حکم دیا کہ اب اس آدم کے آگے سجدہ کرو۔ سبھوں نے سجدہ کیا لیکن ایک نہ ماننے والا کھڑا رہا اور اس نے سجدہ نہ کیا۔ خدا نے فرمایا کہ جلدی سجدہ کرو۔ یہ ابلیس (جن) تھا اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ مجھے کچھ گزارشات کرنے کی مہلت دیجئے اور فوری طور ہلاک کرنے سے بچنے کی مہلت عطا فرما دیجئے تا کہ میں دل کی بات بلا کسی خوف و خطر کے عرض کر سکوں۔ میں حضور کا ایک نہایت ہی قدیم عبادت گذار ہوں۔ ذرا میری گذشتہ عبادت کو بھی یاد فرما دیجئے اگر چہ میرا کلام ایک ناروا حجت ہے اس کے باوجود اپنی عطا سے کچھ میرے حال پر مہربانی فرما دیجئے۔ خدا نے فرمایا کہ جلدی اپنے دل کی بات ظاہر کرو ورنہ

میں روگردانی کرنے کی پاداش میں تمہارے کان اُکھاڑوں گا۔اس کے بعد ابلیس نے کہا کہ مجھے آپ کا پہلا حکم یہی تھا کہ وہ کافر ہے جو میرے بغیر کسی اور کو سجدہ کرے اب جب آپ مجھے دوسرا حکم دے رہے ہیں مجھے اس کے معنی ومطلب سے آگاہ فرمادیجئے۔میں دوہری مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ پھر بات یہ بھی ہے کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا،کیا آگ مٹی کے سامنے سجدہ ریز ہوجائے گی ؟ اللہ نے فرمایا تمہارا دریافت کرنا بالکل نامناسب ہے کیا تم نے میری تقریر جو سبھوں کے سامنے کی نہ سنی کہ میں اُن باتوں کو جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ابلیس کے ساتھ مکالمے کو ختم کرتے ہوئے اللہ کی پاک ذات نے مجھے خلعتِ خلافت سے نوازا۔ مجھے زمین وآسمان پر فوقیت عطا کی ۔ پانی ،آگ اور ہوا پر اختیار دیا کہ تو آگ کو استعمال کر کے طرح طرح کی نعمتیں پکائے گا اور اگر اسی آگ کا غلط استعمال کرنا چاہے گا تو ایک دیا سلائی سے ایک دنیا کو راکھ میں بدل دے گا۔ہوا پر ایسی حکمرانی عطا کی کہ دوسرے عناصر کی مدد سے ہوا کے کندھوں پر سوار ہوجاؤں مثلاً ہوائی جہاز وغیرہ کے ذریعے سے ۔ پانی سے پھولوں اور کانٹوں کو تازہ کرسکتا ہوں یا اس کے برعکس پانی کی ایک بوند کے لیے کسی کو تڑپا تڑپا کر مار بھی سکتا ہوں۔مٹی پر یہ اختیار دیا کہ اس سے میوے اور اناج حاصل کروں یا اسی کو رزاق مان کر دھرتی ماتا ہی کی پوجا پاٹ کروں ۔ جڑی بوٹیوں سے چاہوں تو اعلیٰ قسم کی ادویات تیار کرسکوں یا اُن سے وہ زہر بنا لوں جو دوسروں کی جان لے لے۔لوہے پر یہ اختیار دیا کہ کاٹنے والی شمشیر

بناؤں یا اس کے برعکس خدا کے فرمانبردار بندوں کو ہی ماروں یا امانت میں خیانت کرنے والوں کو ماروں ۔ اگر اس عطائی طاقت سے چاہوں تو خدا کے ساتھ بغاوت کرنے والوں کو ماروں یا چاہوں تو خدا کے فرمانبردار بندوں کے ہی سر جُدا کروں ۔ بنائی ہوئی شمشیر کو کچھ بھی اختیار نہیں کہ وہ میرے حکم و ارادہ سے روگردانی کرے چاہے میں مارنے میں حق بجانب ہوں یا ناحق پر ہوں ۔ مجھے لسانی قوت عطا کی ۔ بول چال کا اختیار دیا ۔ مجھے سچ بولنے کا اختیار بھی دیا تا کہ سب سے اعلیٰ پالنہار کی تعریف کروں یا اُسی کے بھیجے ہوئے دین و مذہب پر حملہ کروں ۔ پوری کائنات میں زبان سے بولنے کا اختیار مجھے دیا گیا مگر یہ لسانی طاقت مجھے اس لیے عطا کی گئی ہے کہ میں دنیا میں اس بات کی گواہی دوں کہ میرا پالنہار سب سے اونچا اور سب سے بڑا ہے ۔ اتنی طاقتوں کا مالک بنانے کے بعد اگر میں اس کو اپنے خالق و مالک کی طرف سے عطا کردہ عزت واکرام سمجھوں تو میں نے بازی جیت لی اور مجھے اپنے مطلب کو پانے میں کامیابی حاصل ہوئی ۔ ان عطائی قوتوں کے احسان کو بھول کر اگر میں اپنے آپ کو کسی کا نائب نہ سمجھوں بلکہ ایک آزاد آقا کی طرح اپنے آپ کو تصور کروں تو مجھ سے زیادہ اور کوئی نقصان میں پڑنے والا نہیں ہے دیگر مخلوقات نے عرض کیا کہ اے جہانوں کے خدا آپ سارے پیدا کرنے والوں سے بہتر پیدا کرنے والے ہیں ۔ آپ نے پیاری شکل کا انسان پیدا کیا بقیہ سب کائنات کو اس کی خدمت میں لگایا ۔ ہماری ایک استدعا بھی سن لیجئے ۔ اگر ایسی صفات کا انسان بہرے کانوں والا

بنے گا اور کتاب سن کر اس کو یاد نہ کرے گا تو چونکہ آپ قانوناً رحمان ورحیم بھی ہیں۔ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن بھی آپ ایسے رحیم وکریم بن جائیں گے کہ حساب لینے کے بغیر ہی اور کسوٹی پر پرکھے بغیر ہی اس کو چھوڑ دیں گے اور اس طرح ہماری ساری خدمت ضائع ہو جائے گی۔فرمانبردار کائنات کی یہ سنجیدہ بات چیت سن کر میں کانپنے لگا اور اسی دوران میرے مالک نے مجھ سے فرمایا کہ دیکھتے ہو۔کہ کائنات کس درجہ آپ کی رقیب بنی ہوئی ہے۔اگر چہ میں اپنے ہی قانون کے مطابق قیامت کے روز حساب لینے والا ہوں اور وہ قانون میں نے خود ہی وضع کیا ہے اور لکھ کر خشک بھی ہوا ہے لیکن تمہاری قسمت اور عزت کی شان کو دیکھ کر انہیں رشک آتا ہے اور یہ بے ضرورت بات کہی۔مالک نے پھر تاکیداً فرمایا کہ اچھی طرح دیکھ اور ان باتوں کو سن۔ خبردار ہو جا اور غیب میں جا کر وعدہ خلافی نہ کرنا۔ہوش وحواس سے کام لینا۔ میں قیامت کے دن اعلیٰ پایہ کی عدالت قائم کروں گا نہ تم پر کسی کو تہمت لگانے کی ہمت ہوگی اور نہ ہی کوئی تمہارا بیجا سفارشی ہوگا۔البتہ یہ اور بات ہے کہ میری اجازت سے کوئی سفارش کرے۔لیکن عمومی طور سے قانونی بات یہی ہے کہ کوئی خواہ مخواہ کی تہمت تیرے اوپر نہ باندھے گا۔نہ آپ کے خلاف کوئی چغل خوری کرے گا۔اگر نیکی کا پلڑا بھاری ہوگا اور زمین کے ساتھ لگ جائے۔یاد رکھنا تب تو تم جیت گئے اور تم عقل مند اور ماننے والوں میں سے شمار ہونگے۔حکم ہوگا اپنی نیکیوں کا کھاتہ دائیں ہاتھ میں لے لو۔حوریں تیری منتظر ہیں مٹھیاں بند کر کے دوڑو۔اگر بُرے کرتوت غالب آگئے اور وہی پلڑا

جھک گیا تو سمجھ لینا تمہاری حالت ایسی ہار سے بہت بُری ہوگی۔ تجھ سے کہا جائے گا کہ نکالو بایاں ہاتھ اور اپنے بُرے کرتوتوں کا کھاتہ پیٹھ پیچھے بائیں ہاتھ میں لے لو۔ آگ تمہاری منتظر ہے اپنے آپ کو بھی کہیں چھپا کر یہ اعمال نامہ دکھاؤ۔ ہائے افسوس اُس وقت میں دیگر مخلوق کے سامنے نہایت ہی شرمندہ اور غمگین ہوگا۔ میری جوگت بن جائے گی اُس کو دیکھ کر میرے ماتھے پر شکن نمودار ہوں گے۔ وہ فرشتے کس قدر خوش ہوں گے جنہوں نے ابتداء میں ہی کہا تھا کہ یہ انسان فسادی اور خون خرابہ ثابت ہوگا۔ ابلیس خوش ہوجائے گا کہ انسان ہارا اور اپنی شکایت دہرائے گا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ انسان کم عقل ہے۔ ایسی صورتِ حال میں کون ہوگا جو میری سفارش کرے گا۔ اللہ نے فرمایا میرے ساتھ اس وقت کا یہ وعدہ اچھی طرح یاد رکھو تا کہ حساب کرنے کے وقت تمہارا کوئی گلہ نہ رہے۔ جو کوئی قیامت کے دن وعدہ خلاف ثابت ہوگا چاہے وہ عورتوں میں سے ہو یا مردوں میں سے اور جو کوئی مشرک ثابت ہوگا اُن کا ٹھکانا بلا شک وشبہ آگ ہے اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ ایماندار جو اپنی نافرمانیوں سے واپس لوٹ کر سچے دل سے توبہ کریں گے اور نافرمانوں کے طور طریقے چھوڑ کر میری طرف لوٹیں گے اور بزبانِ حال اعتراف کریں گے کہ اے اللہ اپنی کمزوریوں کے باعث ہم کبھی اس طرف گئے اور کبھی اُس طرف۔ آپ سے دوری اختیار کرکے **ظلوما جھولا** کی میراث میں پھنس کر نفس اور شیطان کے دھوکہ میں آئے لیکن تیرے فضل نے ہماری دستگیری فرمائی اور ہمیں اس بات کی سوجھ بوجھ نصیب ہوئی کہ ہم اپنی

جان کے دشمنوں کی تابعداری ہی کرتے ہیں۔اپنے گذشتہ بےادبی سے پھر کر واپس آئے اب تو ہمارے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کر کیوں کہ ندامت کی آگ سے ہمارا جسم جل گیا ہے۔تیری دستگیری سے ہماری آنکھوں میں روشنی آئی اور تمہارے ساتھ کیا گیا وعدہ یاد آیا اب تو ہماری حالت زار پر رحم فرما کہ ہم ٹوٹے ہوئے دل لے کر آپ کی خدمت میں شرمندہ رو حاضر ہیں ۔ایسے شرمندہ اقراری مجرموں کی رقت آمیز گفتگو پر مجھے رحم آئے گا جو اگرچہ وہ بہت دیر سے ہی راہِ نجات کی طرف لوٹے ہونگے، پھر بھی اس قسم کے لوگوں کو وہ حقوق جو میری طرف سے ان پر عائد تھے معاف کروں گا لیکن حقوق العباد کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے جس کی طرف اسی دنیا میں دھیان دے کر اس کا سدِ باب کرنا چاہیئے وگرنہ یہ ایک فتنہ بن کر قیامت کے روز گلے میں لٹکے گا۔

مراد ما نصیحت بود و کردیم

حوالت با خدا کردیم و رفتیم

ترجمہ: ہماری خواہش یہ تھی کہ تجھے نصیحت کریں وہ تو ہوگئی اب تجھے خدا کے حوالے کرتے ہیں اور تم سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ختم شد